جسم بے جان

علم ممات

عبدالمعز شمس

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

جسم بے جان

علم ممات

(THANATOLOGY)

ڈاکٹر عبدالمعز شمس

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : 2014
تعداد : 550
قیمت : -/90روپئے
سلسلۂ مطبوعات : 1187

JISM BE JAAN

Elm-e-Mamaat **(THANATOLOGY)**

By: Dr. Abdul Moiz Shams

ISBN :978-93-5160-040-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر:49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159 ای-میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای-میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی-110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے۔ اظہار کے سانچوں پر قابو پانے میں صدیاں لگی ہیں۔ اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں۔ زبان کا سفر حقیقت سے مجاز تک کا نہایت بامعنی سفر ہے۔ مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں۔ مفروضے سے معروضے کی منزل مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے۔ فکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں ردو قبول سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جذبے، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے۔ زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے۔ ایک دن میں زبان بنتی ہے نہ قواعد۔ نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں پیچیدگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ زبان نامیاتی حقیقت ہے۔ اسی لیے نئے نئے سیاق میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر لفظ معنوی امکانات میں ایک سے زائد سیاق رکھتا ہے۔ ہر لفظ اپنے ساتھ مختلف تصورات لے کر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی سادہ اور مجرد، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ہر لفظ اپنی تخلیق کے بعد جب کچھ زمانی عرصہ گزار لیتا ہے تو اس کے معنوی حدود متعین ہو جاتے ہیں اور اس کی سند لغت فراہم کر دیتا ہے۔ اردو نے اپنا ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر

اردو میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو یکی روشنائی عطا کر کے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔کونسل نے متنوع موضوعات پر کافی کتابیں شائع کی ہیں۔سائنسی موضوعات پر توجہ اردو میں کم دی گئی ہے۔کونسل کی کوشش ہے کہ اس موضوع پر اہم لکھنے والوں سے کتابیں لکھوائے اور عوام تک پہنچائے۔عبدلمعز شمس کا شمار ان اہم قلم کاروں میں ہے جو سائنسی موضوعات کو اردو میں تندہی اور تسلسل سے منتقل کر رہے ہیں۔پیشے سے ماہر امراض چشم ہیں اور کئی ممالک میں اپنی خدمات پیش کر چکے ہیں۔ان کی کتاب 'جسم بے جان' سائنسی موضوعات پر کونسل کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے جس میں موت کی فلسفیانہ حقیقت سے لے کر سائنسی حقائق تک کے مباحث کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔بڑی بات یہ ہے کہ مختلف فلسفوں، مذاہب کے حوالوں، شرعی احکامات اور قرآنی آیات کو موصوف نے جگہ بہ جگہ نقل کیا ہے اور افہام وتفہیم میں ان سے مدد لی ہے۔اس کتاب کی کئی جہتیں ہیں۔طبی، اخلاقی، قانونی اور انسانی مسائل کو موت کے مفہوم سے جوڑ کر اہم نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔موت کی نشانیاں، موت سے پہلے اور بعد کی صورت حال، دماغی موت کی پیچیدگیاں، اعضا کی منتقلی کے مختلف پہلو، قتل اور خودکشی کے ضمن میں مرسی کلنگ اور آنرکلنگ کے جدید تصورات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔مجموعی طور پر یہ کتاب ان حضرات کے لیے تحفے سے کم نہیں جو زندگی اور موت کے گہرے تصورات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
(ڈائرکٹر)

فہرست

مقدمہ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	vii
تاثرات	(پروفیسر) ڈاکٹر احمد عبدالحیٔ	xi
جسم بے جان کی جاندار باتیں	(پروفیسر) حکیم سید مودود اشرف	xv
تقریظ	ڈاکٹر سعود عالم قاسمی	xxi
لمحۂ فکریہ		1
موت	(Death)	7
موت کی نشانیاں	(Signs of Death)	13
موت کے بعد	(AfterDeath)	21
مردہ جسم کو ٹھکانے لگانے کے طریقے	(Disposal of Dead Body)	29
موت کے بعد (اسلامی نقطۂ نظر سے)	(IslamicPointofViewAfterDeath)	41
کوما	(Coma)	51
دماغی موت	(Brain Death)	65
دماغی موت اور پیچیدگیاں	(Brain Death & Complications)	77

اعضا کا عطیہ	(Organ Donation)	85
اعضا کی منتقلی کے نئے پہلو	(New Dimension of organ Transplant)	97
قتل بہ جذبۂ رحم	(Euthanesia)	107
مرسی کلنگ اور دورِ جدید	(Mercy Killing & Modern Era)	119
آنر کلنگ	(Honour Killing)	131
قتل	(Murder)	139
اسقاطِ حمل	(Abortion)	147
طفل کشی	(Infanticide)	165
مادہ طفل کشی	(Female Infanticide)	173
خودکشی	(Suicide)	181
خودکش حملہ	(Kamikaze)	191

ooo

مقدمہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں اولین نعمت ''زندگی'' ہے اور اس کے لیے انسانی جسم کی شکل میں بہترین قالب عطا فرمایا: ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (سورہ تین:4)۔ لیکن جسم کی ساری صلاحیتیں، فکر وعمل کی تمام قوتیں اور حسن و جمال کے سارے نقوش زندگی سے محروم ہوتے ہی اپنا وجود کھودیتے ہیں؛ اس لیے دنیا میں موجود ساری نعمتیں انسان کے لیے اسی وقت تک قابل استفادہ ہیں، جب تک کہ رمق حیات اس میں باقی ہے؛ لیکن عجیب بات یہ کہ فضا کی بلندیوں پر کمندیں ڈالنے والا اور سمندر کی گہرائیوں کو فتح کرنے والا انسان خود اپنی زندگی کے معاملات میں بالکل بے بس ہے، جب دبے پاؤں 'موت' زندگی کے دروازہ پر دستک دیتی ہے تو تخت اقتدار پر متمکن بادشاہ سے لے کر زمین کے بستر اور آسمان کے سائے میں سونے والے مزدور تک ہر متنفس عجز و درماندگی کا نمونہ ہوتا ہے اور اسے فخر وغرور کا سر جھکاتے ہوئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ:

آدمی بلبلا ہے پانی کا
کیا ٹھکانہ ہے زندگانی کا

انسان اپنی بے پناہ علمی فتح مندیوں اور سائنس واکتشافات کی دنیا میں اتھاہ کامیابیوں

کے باوجود اس عقدہ کو حل نہیں کر سکا کہ زندگی کیوں کر آتی ہے اور کیسے داغ فراق دے جاتی ہے؟ قرآن مجید نے صاف کہہ دیا ہے کہ یہ صرف امر ربانی سے عبارت ہے ویسئلونک عن الروح قل الروح من أمر ربی (سورہ اسراء:85)۔اسی لیے ماہرین نے ہمیشہ موت کی حقیقت کے بجائے مرنے والے پر طاری ہونے والی علامات سے بحث کی ہے اور علما شریعت نے ہمیشہ موت کے پہلے اور موت کے بعد جاری ہونے والے احکام کو اپنا موضوع بنایا ہے، سائنس کا کام کھوج اور جستجو ہے اور اس وقت سائنسی دنیا شب و روز موت کی حقیقت کو جاننے کے لیے کوشاں ہے، اس تحقیق نے اس کو اس تجزیہ تک پہنچا دیا ہے کہ انسان کے پورے وجود پر موت کا کلی اثر بہ یک وقت طاری نہیں ہوتا؛ بلکہ دماغ، دل، اعضا اور خلیات وغیرہ بتدریج موت سے دوچار ہوتے ہیں اور زندگی کے آثار کو بالکلیہ ختم ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔

اردو زبان میں یوں بھی سائنسی موضوعات پر کم لٹریچر ہیں اور خاص کر ایسے پیچیدہ موضوعات پر تو نہیں کے برابر ہیں۔ڈاکٹر عبدالمعز شمس ماشاء اللہ ان گنے چنے دو چار افراد میں شامل ہیں، جو اردو زبان کو سائنس کے سرمایہ سے مالا مال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ان ہی کی ایک اہم تالیف ''جسم بے جان'' میرے سامنے ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔اس حقیر کو ایک عرصہ سے اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے بہت کم اس کا موقع ملتا ہے کہ جن مسائل پر قلم اٹھانا ہے، ان کے علاوہ کسی اور کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے؛ لیکن اس کتاب کے اسلوب اور اس کے دلچسپ مواد کی وجہ سے علی گڑھ سے دہلی کے سفر کے درمیان تقریباً پورا مسودہ پڑھ گیا۔اس میں مصنف نے موت کی علامات، موت کے بعد طاری ہونے والے اثرات، تدفین اور آخری رسومات کے سلسلہ میں مختلف اقوام اور مذاہب کا طریقہ کار، کوما کی حقیقت اور اس کے درجات، دماغی موت، اعضا کی پیوند کاری، قتل کی مختلف صورتوں نیز اسقاط حمل، طفل کشی اور خودکشی وغیرہ پر تفصیل سے فنی معلومات پیش کی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ تین خوبیاں ایسی ہیں، جو اس تالیف کو امتیازی حیثیت عطا کرتی ہیں۔ ایک تو اسلامی تعلیمات پر مؤلف کا اٹوٹ یقین اور سائنسی حقائق کو پیش کرتے ہوئے قرآنی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کے بیان کی صداقت اور واقعیت کی توضیح، نیز کہیں کہیں احتیاط کے

ساتھ شرعی نقطۂ نظر کی وضاحت، دوسرے: مسائل کی تفہیم میں حسن ترتیب اور مختلف شکلوں کی تقسیم کرتے ہوئے وضاحت، اس سے مضمون کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور قاری کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے، تیسرے: سہل اور دلچسپ تعبیر؛ حالانکہ اردو زبان ''مرحوم'' ہوتی جارہی ہے اور جدید تعلیم یافتہ حضرات نے تو شاید اس پر فاتحہ بھی پڑھ دیا ہے؛ بلکہ بعض احساس کمتری میں مبتلا دانشور اردو پڑھنے، لکھنے اور بولنے کو اپنی کسر شان سمجھتے ہیں اور اگر اردو میں کچھ لکھتے ہیں تو اس میں بھی انگریزی الفاظ کی کثرت 'کباب میں ہڈی' کا مصداق بنتی رہتی ہے، لیکن مؤلف کی اردو شستہ سہل؛ بلکہ ایک حد تک کلاسیکل اور فارسی آمیز ہے۔

علی گڑھ کے ایک پروگرام میں پہلی بار مؤلف سے اس حقیر کی ملاقات ہوئی اور ان کی سلامت فکر سے متاثر بھی ہوا۔ ان کا آبائی وطن پٹنہ (بہار) ہے؛ لیکن اب علی گڑھ میں مقیم ہیں، رانچی یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہے۔ 23 سال سعودی عرب اور ایران میں خدمت کی ہے، امراض چشم کے ماہر طبیب اور سرجن ہیں اور اس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مہمان استاذ کی حیثیت سے تدریس کی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سائنسی موضوعات پر پابندی سے ماہنامہ سائنس میں مضامین لکھتے ہیں، چنانچہ اسی موضوع پر ان کی کئی تالیفات طبع ہو چکی ہیں اور سبھی لائق مطالعہ ہیں۔

مصنف کی یہ کتاب (جسم بے جان) نہ صرف ان کے ہم پیشہ لوگوں اور فن طب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے گراں قدر تحفہ ہے؛ بلکہ یہ علما اور خاص کر فقۂ افتاوی سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لیے بھی قابل مطالعہ ہے؛ کیونکہ یہ بہت سے شرعی مسائل کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوگی اور صورت مسئلہ کو سمجھنے کو آسان کردے گی۔ میں اس اہم کتاب کی تالیف پر مصنف کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کو پذیرائی عطا فرمائے اور لوگوں کو اس سے خوب خوب فائدہ پہنچے۔ واللّٰه هو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی، دہلی)

(ناظم المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

21 ربیع الاوّل 1433ھ

14 فروری 2012

تاثرات

کائنات کی بیشتر حقیقتوں میں لوگوں نے اقرار وانکار کی گنجائش تلاش کرلی ہے مگر موت وہ حقیقة ہے جس سے منکر خدا بھی انکار نہیں کرسکتا۔ یہ وہ آفاقی سچ (Universal Truth) ہے جس کا اقرار سہ کرتے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب اور تمام مذہبی کتابوں میں کسی نہ کسی انداز سے اس پر روشنی ڈالی گئی۔ فلسفیوں نے اس کی زلفیں سنوارنے کی جتنی کوششیں کیں یہ اور بھی الجھتی گئی اور یہ راز کسی کی سمجھ میں نہ آسکا۔

ہمارے شاعروں نے بھی اس موضوع پر مسلسل طبع آزمائی کی ہے۔ ہر چند کہ علامہ اقب نے زندگی کو ''پیمانہ امروز وفردا'' سے ناپنے سے منع کرتے ہوئے زندگی کو ''جاوداں'' اور ''پیہم دوار کہا ہے مگر دوسرے ہی لمحہ ''اول و آخر فنا'' اور ''ظاہر و باطن فنا'' کہہ کر موت کو خراج عقیدت پیش کردیا ہے۔ جگر صاحب نے تو اس معاملہ کو ایک نیا ہی رخ دے دیا۔ وہ کہتے ہیں:

موت کیا ایک لفظ بے معنی　　جس کو مارا حیات نے مارا

پنڈت برج نرائن چکبست نے مذہبی عقائد سے اوپر اٹھ کر ایک سائنس داں کی طرر اس کی یوں تشریح کی ہے:

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

سائنسی اعتبار سے ''اجزا کا پریشاں ہونا'' سچائی سے قریب تر ہوسکتا ہے مگر بات اس پر ختم نہیں ہوتی۔ موضوع مزید وضاحت کا طالب ہے، تبھی تو ایک شاعر سوال کرتا ہے:

یہ کیا دست اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے توڑنا اور پھول ویرانے میں رکھ دینا

گویا موضوع پھر سوال بن گیا۔ مگر حتمی بات تو قرآن کریم میں خالق کون و مکاں نے کہہ دی ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوت (ہر ذی نفس کو موت کا مزا چکھنا ہے)

گویا زندگی اور موت لازم و ملزوم ہیں۔ اس حقیقت کے بعد مزید سوال کی گنجائش نہیں رہ جاتی مگر انسانی ذہن میں تجسس کا عمل ہمیشہ کارفرما رہتا ہے۔ اسی جذبہ تجسس نے ہمارے دوست ڈاکٹر عبدالمعز شمس کو سوچنے، تحقیق کرنے اور لکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خود ماہر طب امراض چشم ہیں، سائنس داں ہیں اور قرآن فہمی کی سعادت سے فیض یاب ہیں، اسی لیے ان کی تحقیق دلچسپ بھی ہے اور حقیقت سے قریب تر بھی۔ سائنسی حقائق و تجربات کو اکثر مقام پر قرآنی آیات سے مزین کر کے ڈاکٹر شمس نے بڑا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

برسبیل تذکرہ یہ کہہ دوں کہ ہمارے بعض دانشور غیر ضروری حد تک قرآن اور سائنس کا موازنہ کرتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ وہ اُم الکتاب ہے۔ البتہ اس کی آیات میں کائنات، تخلیق کائنات اور دیگر تمام علوم کے حقائق کی نشانیاں موجود ہیں۔ حالانکہ ہنوز انسانی ذہن ان تمام حقائق و رموز سے کلی طور پر آشنا نہیں ہو سکا ہے اور شاید اسی لیے متعدد مقامات پر قرآن کریم میں غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ شمس صاحب نے غور کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سمندر سے موتی نکالنے کی سعی کی ہے اور اس شناوری میں کامیاب ہوئے ہیں۔

شمس صاحب نے بڑی دانش مندی سے کتاب کا نام ''جسم بے جان'' رکھا ہے۔ یعنی موت جسم کے بے جان ہو جانے کا نام ہے روح کا نہیں۔ روح تو ابدی ہے۔ فنا تو جسم کی تقدیر ہے روح کی نہیں۔ وہ تو لازوال ہے۔

اس کتاب کی اہمیت وافادیت اور ہمہ گیری کا اندازہ فہرست مضامین سے ہی ہو جاتا ہے۔ موت، موت کی نشانیاں، موت کے بعد، مرسی کلنگ (Mercy Killing)، طفل کشی (Infanticide)، خودکش حملہ (Suicide Attacks)، اعضا کے عطیہ جیسے کوئی انیس ابواب قائم کر کے ڈاکٹر شمس نے بڑے عالمانہ انداز سے موضوعات کا تجزیہ کیا ہے اور معروضی انداز میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر اردو میں اپنی نوعیت کی یہ واحد کتاب ہوگی، اس لیے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر شمس مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اتنی جاں فشانی سے ایک منفرد موضوع پر قلم اٹھایا اور اس کو کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ اس کے مطالعے سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور بحث ونظر کے امکانات بھی سامنے آئیں گے۔ ڈاکٹر شمس کی یہ کتاب اردو کی علمی کتابوں کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

میری دعا ہے کہ رب العزت ڈاکٹر شمس کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ جزاک اللہ خیر!

ڈاکٹر احمد عبدالحئی

'جسم بے جان' کی جاندار باتیں

جناب ڈاکٹر عبدالمعز شمس صاحب کی کتاب ''جسم بے جان'' کا مسودہ کئی بار پڑھا۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر خوب سے خوب تر ہے۔ زیر بحث مسائل پر قرآن وشریعت، سائنسی معلومات، مفکرین کے خیالات، دنیاوی قوانین، رسم ورواج، تاریخ، دیگر مذاہب کے اقوال واحکام ان سب کا بہترین مجموعہ ہے جس نے ایک حسین گلدستے کا روپ دھارلیا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مؤلف کی یہ تالیف عالمانہ بھی ہے اور محققانہ بھی۔ اس میں نہ تو ایسی تشنگی پائی جاتی ہے جو انسان کو بے قرار کردے نہ ایسا الجھاؤ کہ ذہن پر بار بن جائے۔ اردو میں اس طرح کی کتاب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اسلوب نگارش دلکش، زبان شستہ، سہل، رواں، کثیر المعلومات، مستند حوالوں سے پُر، قرآنی آیات سے لبریز، زبان پر گرفت، یہ خوبیاں ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ کی وسعت، اسلامی تعلیمات سے محبت ورغبت اور مسائل کی گہرائیوں میں اترنے کی استعداد کا بہ آسانی پتہ دیتی ہیں۔

اس کتاب کے لکھنے میں مؤلف کی عام روش یہ رہی کہ بیشتر قرآنی آیات کو موضوع بحث بناتے ہوئے سائنس کی جدید تر معلومات کو اس ضمن میں بہت نکھار کر پیش کرتے ہیں۔ جہاں ضرورت دامن گیر ہوئی بعض فقہی مسائل کو بھی نسبتاً تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مقصد اس ساری کاوش کا اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر قرآن اور شریعت محمدی اپنی روشن اور

واضح ہدایات کے ساتھ ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔ سچ یہ ہے کہ انسانی تخلیق کا مسئلہ ہو یا موت وزیست کا یا بعث بعدالموت کا قرآن نے اس سے سیر حاصل بحث کی ہے اور بہت سے ایسے رموز سے پردہ اٹھایا ہے، جس سے اسلام سے پہلے لوگ نابلد تھے۔

انسانی تخلیق کا مسئلہ ہو یا موت وزیست کا، استقرار حمل کی بات ہو یا انسانی نشوونما کے مختلف ادوار کی یا بعث بعدالموت کی مفکرین زمانہ خواہ مذہب سے متعلق ہوں یا نہ ہوں، ہمیشہ یہ مسائل ان کی فکر کے محور بنے رہے اور آج بھی ہیں۔ غور وخوض کے بعد جس نے جو بھی نتیجہ اخذ کیا وہ اس پر قائم ہو گیا۔ قطع نظر اس سے کہ دوسرے مفکرین اس بات میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

تلاش وجستجو کا یہ سلسلہ صرف فلسفیوں تک محدود نہیں رہا بلکہ انبیاء تک دراز ہوتا ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ کی اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست رب ارنی کیف تحیی الموتیٰ۔ ''آپ مجھے دکھا دیجیے مردوں کو زندہ کیسے کریں گے؟'' یا ایک بستی کو دیکھ کر جو پوری طرح تہس نہس ہو گئی تھی حضرت عزیر کا یہ کہنا کہ "انی یحیی ھذہ اللہ بعد موتھا." فرمایا اس بری حالت تک پہنچنے کے بعد اب اس کو کیسے زندہ کریں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دکھایا کہ ہم مردوں کو اس طرح زندہ کرتے ہیں اور یہ سب ان کے اطمینان قلب کے لیے تھا۔ حالانکہ اس پر ان کو پورا یقین تھا۔ اس طرح کی آیات قرآنی اس طرف مشیر ہیں کہ ''تجسس انسان کی فطرت میں داخل ہے۔''

نزول قرآن کے بعد ایسی ساری بدلیاں چھٹ گئیں جو انسانی ذہن کو ظلمت وتاریکی کی طرف لے جاتیں یا لے جا سکتی تھیں۔ خالق حقیقی نے اپنی اس عجیب وغریب مخلوق کے وہ سارے عقدے حل کر دیے جو فلسفیوں کے نزدیک لاینحل تھے۔ خواہ اس فکر کا تعلق انسانی تخلیق سے ہو یا موت وزیست سے یا بعث بعدالموت سے۔ کلام الٰہی میں اس کو اتنا آسان اور دلنشیں بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ ہر کوئی سمجھ لے اور بات دل میں اتر جائے (الحمد اللہ)۔

مؤلف نے اپنی کتاب میں ایسی تمام آیات کو یکجا کر دیا ہے جن کا تعلق ان مسائل سے ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ البتہ عنان توجہ کو اس طرف موڑنا ضروری ہے کہ ایسی تمام آیات جو مصنف نے جمع کی ہیں اس سے صرف اللہ کی قدرت کاملہ کا

اظہار نہیں ہوتا بلکہ یہ آیتیں اللہ کی وحدانیت کو بھی بھرپور انداز میں ثابت کرتی ہیں۔ تخلیق سے موت تک کے سارے مراحل طے کرانے میں اس کا کوئی شریک نہیں، وحدہٗ لاشریک لہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ ان تمام امور کو ذکر کرنے کے بعد قرآن انسان کو اللہ کی الوہیت، وحدانیت اور کمال قدرت کا قائل کرنا چاہتا ہے۔ حضرت آدمؑ کو مٹی سے، حضرت حوا کو آدم کی پسلی سے، حضرت مریم کو بلا باپ کے پھر انسانی تخلیق کو نطفہ اور رحم مادر سے وابستہ کردیا، رحم مادر میں بچے کے نشو و نما نے ابتدائی مراحل طے کیے اور وقت مقررہ پر اللہ اس کو اس دنیا میں لے آیا۔

یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں سے اسلام اور سائنس کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔

سائنس داں ہر چیز کی تخلیق میں مادہ کو اصل قرار دیتے ہیں اور اسلام یہ سکھاتا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے مثلاً سائنس نطفہ کی ماہیت، اس کے اجزاء کا تجزیہ، مادہ کا مرکز جنین کی شکم مادر میں پیدائش و پرورش اور بچہ کے اس دنیا میں آنے کے بعد بڑے ہونے تک اندرون بدن اور بیرون بدن ہونے والے تغیرات، موت و حیات کے ظاہری اور باطنی اسباب، علل و خلل نیز اس طرح کے بہت سے امور سے بحث کرتا ہے۔ یہ بحث یا اس طرح کے دوسرے مباحث کا تعلق سراسر موجودات سے ہے اور اس کا مطالعہ ذہن کو ریسرچ و تحقیق، تلاش و جستجو کی اتھاہ گہرائیوں میں اترنے کی ترغیب دیتا ہے اور اسی میں ساری زندگی صرف ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن غور و فکر، تلاش و جستجو کا مداح ہے۔ "ویتفکرون فی خلق السموات والارض" وہ غور کرتے ہیں آسمان و زمین کی پیدائش میں لیکن مقصد اللہ کی معرفت کو ٹھہراتا ہے "ربنا ما خلقت ھذا باطلا" اور کہتے ہیں اے ہمارے رب آپ نے ان چیزوں کو بیکار نہیں بنایا یعنی اس ریسرچ و تحقیق سے جو بھی حاصل کرنا چاہیں کرلیں یہ نہ بھولیں کہ خود مادہ اور ان میں موجود ساری صلاحیتیں اسی ذات کی پیدا کردہ ہیں جو خالق کائنات ہے یعنی اللہ ہر چیز پر قادر ہے جب اور جس وقت وہ چاہتا ہے وہ کیفیت جو اس مادہ کی شناخت ہے اس سے جدا کردیتا ہے۔ ان اللّٰہ علی کل شئی قدیر۔ قلنا یا نار کونی برداوّ سلاماً علی ابراھیم۔ اور آگ ٹھنڈی اور سرد ہوگئی۔ یہ اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

مقاصد حیات: اس کا تعین بھی ضروری تھا ورنہ انسان کی زندگی شتر بے مہار جیسی ہوتی جو جی چاہتا کرتا اور مرکھپ جاتا۔ فلسفیوں کی کارگزاری اس بات میں بس اتنی رہی الم ترا ننھم فی

کل واد بھیمون (تو نے نہیں دیکھا وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں)
اس کے برعکس اسلام نے انسان کو ایک ضابطۂ حیات دیا جو قرآن اور احادیث کی صورت میں آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کتاب کے ساتھ اللہ نے ایک باکمال سفیر کو بھیجا جن کی زندگی بے داغ تھی اور وہ قرآن کے رموز و اسرار سے اچھی طرح آگاہ تھا نیز قرآنی تعلیمات کو روبہ عمل لانے میں بے مثال تھا۔ انسانوں کے درمیان رہ کر قرآنی احکامات پر عمل کرنا سکھایا، اس کے فوائد سے متعارف کرایا، گمراہوں سے جنگیں لڑیں اور ان کو صراط مستقیم پر لا ڈالا۔ کہاں یہ مرتب و منظم اسلامی تعلیم وتربیت کہاں فلسفیوں کے اقوال — ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔''

اس کتاب کا ایک عنوان ''موت'' ہے۔ اس کو بہت جامع انداز میں ڈاکٹر صاحب نے قلمبند کیا ہے۔ اس کی ضرورت بھی تھی۔ بقول ڈاکٹر صاحب ''موت دو مراحل میں واقع ہوتی ہے جسمانی یا طبی موت۔ سالمی یا خلیاتی موت۔ عام طور پر موت کا مطلب جسمانی موت ہی لیا جاتا ہے جس میں دل و دماغ اور پھیپھڑوں کا عمل کاملاً رک جاتا ہے۔ کچھ دنوں قبل دل کی دھڑکن اور سانس کے رک جانے کو موت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔''

اب جدید سائنسی آلات نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ سرجن دل کی دھڑکن روک کر سرجری کر سکتا ہے۔ گویا دل کی دھڑکن کا عارضی طور پر بند ہونا اس پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ انسان مر گیا بلکہ دل کی دھڑکن مستقلاً بند ہو جائے اور پھر اس کو کسی مشین کی مدد کے بغیر لوٹایا نہ جا سکے تب ہی اس کا شمار موت کی علامات میں ہوگا۔ اسلام میں مردہ کو جلد دفن کرنے کا جو حکم ہے وہ یقینی موت کے بعد ہی ہے۔ ذرا سا بھی شبہ ہو تو وہ مسائل بساط بھر اختیار کرنا چاہیے جو موت کو یقینی بنا دے۔

موت سے معاشی اور فقہی مسائل بھی جڑ جاتے ہیں۔ موت کی دو قسمیں ہوتی ہیں حقیقی اور مشینی۔ اب یہاں ایک بڑا سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اصل زندگی حقیقی موت پر ختم ہو جاتی ہے یا پھر جب تک مشین اس کو زندہ رکھے ہوئے ہے زندہ مانا جائے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ایک بیوہ کب تک عدت میں بیٹھے گی؟ اس کی جائداد کب وارثوں میں تقسیم ہوگی؟ وارث کب تک اس کی طرف سے قرض ادا کرے گا؟ غرض عدت ہو یا جائداد یا قرض کا مسئلہ موت کے تعین کے بعد ہی طے پا سکے گا۔

اس کتاب کا موت، کوما سے لے کر آخر کتاب تک کا حصہ بے حد اہم ہے۔ یوں تو یہ

بحث خالصتاً طبی، سائنسی، اخلاقی، انسانی اور قانونی ہے لیکن درمیان میں مختلف فلسفیوں، مذاہب کی آراء، قرآن وشرعی نقطۂ نگاہ کو بھی بڑے اہتمام سے جگہ دی گئی ہے۔ اس کتاب کا ہر حصہ دلچسپ معلومات سے پُر ہے۔ تاریخ اور واقعات کے ذکر نے اس کتاب کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔

اس بیان میں مؤلف کا امتیاز یہ ہے کہ جہاں تک بن سکا شرعی احکامات اور قرآن کے زاویۂ نگاہ کو مفصلاً اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ان مسائل کا حصہ بن گئے ہیں۔ قرآنی آیات کا برمحل استعمال اور اس کی درست توجیہہ نے اس کتاب کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا ہے۔

اس مضمون میں جو بعض فقہی مسائل اٹھائے گئے ہیں جیسے ''موت کی تعریف''، ''اعضاء کی پیوندکاری''، ''خودکشی''، ''جنین کشی'' وغیرہ یہ ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق بیک وقت انسانیت، مذہب اور قانون تینوں سے ہے اس لیے مؤلف نے اس کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کی کوشش اس جگہ بھی یہی رہی ہے کہ شریعت محمدیؐ نے ان مسائل کو جس گہرائی سے لیا ہے اور جس واضح انداز میں بیان کیا ہے ان کی ہمسری کوئی دوسرا مذہب نہیں کرسکتا۔ قرآن کے اس بیان میں انسانیت، اخلاق اور قانون سب کچھ سموا اٹھا ہے۔ باقی مسائل جو اس دور کی پیداوار ہیں علما اس سے غافل نہیں ہیں اس گتھی کے سلجھانے میں شب وروز لگے ہوئے ہیں۔ کتابوں اور مقالات کے ذریعہ اپنی تحقیقات پھیلا رہے ہیں اور دوسروں تک پہنچا رہے ہیں۔ اس مطالعہ میں سائنس کے اس حصہ کی شمولیت لازمی ہے جس کا تعلق مذکورہ بالا مسائل سے ہے۔ پہلے بھی فقہا طبی مسائل میں ماہرین طب یا ان کی کتابوں سے مدد لیتے تھے اور آج بھی اس کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر عبدالمعز شمس کے ہم بے حد شکرگزار ہیں کہ اردو میں ایک ایسی جامع کتاب تحریر فرمائی جو بیک وقت طلبا، اساتذہ، علماوفقہا سبھی کے لیے مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ اس سلسلہ میں وہ جس محنت شاقہ سے گزرے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یہ کتاب عوام وخواص میں یکساں مقبول ہو اور ہاتھوں ہاتھ لی جائے (آمین ثم آمین)۔ امید ہے یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔

(پروفیسر) حکیم سید مودود اشرف
سابق ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تقریظ

پیش نظر کتاب ''جسم بے جان'' ایک متعین محور پر لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے جو جریدہ سائنس نئی دہلی میں شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔اس کتاب میں حیات و ممات کے رشتہ کی وضاحت مذہب اور سائنس کے حوالہ سے کی گئی ہے۔بالخصوص موت، اس کے اسباب، اثرات اور مابعد تغیرات پر، جسمانی موت اور دماغی موت کی پیچیدگیوں اور موت و حیات کی کش مکش پر علمی، نفسیاتی اور تجزیاتی بحث کی گئی ہے۔یہ کتاب تصورِ موت کے سلسلہ میں علمی اور عملی دنیا میں پائی جانے والی بے اعتدالی کا جائزہ لیتی ہے، اس کا محاسبہ کرتی ہے اور ایک متوازن اور معتبر مطالعہ پیش کرتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا اور آخرت ایک مسلسل زندگی کے دو مرحلوں کا نام ہے: ایک مرحلہ ہے عمل کا دوسرا نتیجۂ عمل کا۔موت ان دونوں مرحلوں کے درمیان ایک عارضی وقفہ کا نام ہے۔ مگر اس وقفہ میں ہزاروں اسرار و رموز پنہاں ہیں جن کی عقدہ کشائی انسان کی علمی اور عملی زندگی کے لیے مفید اور عبرت آموز ہے۔قرآن پاک ہر انسان کو اپنے عزیزوں کی موت کے وقت یاد دلاتا ہے ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔'' بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں۔یہ یاددہانی اس حقیقت کا اعادہ ہے کہ موت حسن عمل کا اختتام نہیں بلکہ سفرِ آخرت اور میزانِ عمل کی تمہید ہے۔بے جان جسم انسانی وجود کے خاتمہ کا اعلان نہیں بلکہ روح کو نئی پوشاک عطا

کرنے کی علامت ہے۔ جسم کی تبدیلی وجود کی تبدیلی نہیں بلکہ لباس کی تبدیلی ہے۔'' خَلَقَ الْمَوتَ وَالْحَیَاۃَ لیبلو کم ایکم احسن عملاً و ھو العزیز الغفور ۔(الملک) اللہ نے موت وحیات کو اس لیے پیدا کیا تا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون حسنِ عمل کرتا ہے اور وہ عزیز وغفور ہے۔

علامہ اقبال نے حیات وموت کے اس فلسفہ کو شعری پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا　　　ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

موت کے فرشتہ کی رسائی ''جسم بے جان'' تک رہتی ہے جب کہ روح یعنی مرکز وجود اپنا سفر خود طے کرتی ہے اور فکر وعمل کے لحاظ سے اپنی مقررہ منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ کتاب کا پیغام یہ ہے کہ خالق کائنات نے اپنی نشانیاں اس کائنات کے ساتھ خود انسانی وجود میں رکھ دی ہیں اور ان کو سمجھنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ''وَفِی اَنْفُسِکُم اَفَلا تُبْصِرونَ۔'' ان نشانیوں کو اور ان کے مطالبات کو سائنس کے معروضی منہاج سے قرآن کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو عبرت ونصیحت کے بے شمار گوشے منور ہوتے ہیں اور حیات وموت کے نفسی، اخلاقی اور سماجی مضمرات بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمعز شمس صاحب نے موت کے مسائل کو سائنس کی خرد بین سے قرآنی اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مشاہدہ باریک اور نتیجہ معنی خیز ہے، وہ علمی اور فنی معلومات کو قرآن وسنت مزین اور معتبر کرتے ہیں اور قاری کو ایک ایسی دنیا سے متعارف کراتے ہیں جس کا سفر ناگزیر ہے مگر زادِ سفر کی فکر بہت کم ہے۔ قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ قرآن کریم کی وہ آیات جو حیات وممات کے نفسیاتی اور عملی تجزیہ سے تعلق رکھتی ہیں، حکمت بالغہ کی ہزاروں نکتہ آفرینی کرتی ہیں مگر بالعموم ہم سرسری گزر جاتے ہیں۔

ان کو سمجھنے اور حاصل کرنے کے لیے قرآن کے عمیق مطالعہ کے ساتھ متعلقہ سائنس کا مطالعہ اور ذہن رسا ضروری ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ میں بہترین رہنمائی کرتی ہے۔ ان موضوعات پر اردو لٹریچر میں جو تشنگی پائی جاتی ہے اسے دور کرنے کا بھی اس میں سامان ملتا ہے۔ کتاب دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے بلکہ اس میں سامانِ عبرت بھی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الالباب۔

پروفیسر (ڈاکٹر) محمد سعود عالم قاسمی
ڈین، فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

لمحہ فکریہ

عنوان تو یہ ہوسکتا تھا کہ ''موت کے بعد کیا ہوتا ہے یا کیا ہوگا'' لیکن معاً یہ خیال آیا کہ قارئین کے ذہن میں آسکتا ہے کہ شاید میں قرآن وحدیث کی روشنی میں آخرت، قبر کے عذاب، منکر ونکیر، روز جزا کے دن کے حساب وکتاب، جہنم کی آگ اور کچھ اسی طرح کی گفتگو کروں گا لیکن میرا ارادہ ہرگز اس موضوع کو چھونے کا نہیں چونکہ یہ میرا میدان نہیں ہے۔ میں تو محض سائنس کی زبان میں باتیں کروں گا اور معلومات فراہم کروں گا۔ چونکہ اس موضوع پر اردو ادب میں بہت کم لکھا گیا ہے، مضامین کے توسط سے موت واسباب موت، موت کے بعد جسم میں ہونے والے تغیرات، کوما (بے ہوشی)، برین ڈیتھ اور اس کے درمیان مسائل، ایوتھنیز (قتل یا بجذبۂ رحم، جنین کشی، طفل کشی، قتل، خودکشی، خودکش حملے وغیرہ)، اعضا کی پیوندکاری، عطیات جسمانی اور اس سے متعلق موضوعات پر معلومات بہم پہنچاؤں گا۔

میں بنیادی طور پر سائنس کا ادنیٰ طالب علم ہوں چنانچہ فطری طور پر قرآن مجید کے مطالعے کے دوران بعض آیات نے بالخصوص مجھے اپنی طرف متوجہ کیا ہے جس میں قرآن کسی ایسے مظہر (Phenomenon) یا حقیقت (Reality) کے بارے میں کچھ کہتا ہے جس کو ہم سائنس میں پڑھتے ہیں۔

مطالعہ قرآن کے دوران میں نے سائنس کے متعلقہ گوشوں Related Areas کا ازسرنو مطالعہ کیا اور اس موضوع پر جدید ترین سائنسی دریافتوں کو تلاش کیا اور سمجھنے کی کوشش کی اور انہی آیات کا انتخاب کیا جنھیں تفصیلی طور پر زیر بحث لانا ہے۔

ہمارا ایمان ہے اور حقیقت ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے جس میں اوّلین وآخرین کے علوم ودیعت ہیں۔ یہ کتاب "بیان لکل شئی" ہے اور ہر چیز کا اس میں ذکر ہے۔

بلاشبہ قرآن کریم تمام انسانوں کے لیے عظیم ترین ہدایت نامہ ہے۔ یہ انسان کو زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی بہم پہنچاتا ہے۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ قرآن علوم وفنون کی کتاب یا سائنس کی درسیات نہیں ہے۔ گرچہ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کا اصل موضوع انسان اور علم ہے۔ قرآن خود کہتا ہے:

حٰمٓ. وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ. إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُون.

(یہ نہایت مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمھارے طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور صاحب عقل اس سے یاددہانی حاصل کریں۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔)

(الزخرف، آیت:3-1)

قُلِ الْعَفْوَ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُون.

(اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم غور کرو)

(البقرہ، آیت:219)

حقیقت یہ ہے کہ قرآن بار بار انسان کو تدبر وتفکر کی دعوت دیتا ہے اور اس کی ایک دو نہیں سیکڑوں آیات میں غور وفکر کی تلقین کی گئی ہے۔

قرآن اس پر سخت حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ لوگ اس میں غور وفکر نہیں کرتے اور اس کے معنی ومفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ اس نور ہدایت سے پوری طرح فیضیاب نہیں ہوسکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَفَلا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا

(کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے پڑے ہوئے ہیں)

(محمد، آیت:24)

قرآن کا تدبر و تفکر پر زور دینا، انسان کو عقل کے استعمال پر ابھارنا ہے وہ اسے غور و فکر کا عادی بنانا چاہتا ہے اور عقلی استدلال (Reasoning) پر غور و فکر کے لیے اُکساتا ہے۔

میں اپنے تمہیدی مضمون میں فی الوقت کلام پاک کی دو سورتوں یعنی سورۃ الحج (آیت 5 سے 7) نیز سورۃ المومنون (آیت 12 سے 17) کا ذکر کروں گا۔ چونکہ ماہر حیاتیات کی توجہ کو شاید انہی آیات نے سب سے زیادہ مرکوز کیا ہے اور اس کے سائنسی مطالعات بہت سی کتابوں میں درج کیے گئے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّى وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئاً وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ. ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَى وَأَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ.

(لوگو! اگر تمہیں زندگی کے بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں

(پھر پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو اور تم میں سے
کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا
ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین
سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینہہ برسایا کہ یکا یک وہ بھیگ
اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اُگلنی شروع
کر دی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ مُردوں کو
زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی،
اس میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں، اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو
قبروں میں جا چکے ہیں۔) (سورۃ الحج، آیت: 5 تا 7)

آیات مبارکہ میں تخلیق انسانی کے مختلف ادوار کا جن میں بڑے بڑے نمایاں تغیرات کا ذکر ہوا ہے میری تحریروں میں یعنی ''جسم و جاں'' کے مسلسل مضمون میں آ چکا ہے۔ میں اپنے اس نئے سلسلہ وار مضمون ''جسم بے جاں'' میں آیت 5 کے اس حصے سے گفتگو شروع کروں گا جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف
پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

اپنی پہلی کتاب ''جسم و جاں'' میں میں نے لمحۂ فکریہ کی دعوت دی تھی کہ اگر ہم اپنی ہی پیدائش پر غور کریں تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ ایک انسان کی ہستی میں اللہ کی حقیقی اور واقعی تدابیر ہر وقت بالفعل کارفرما ہے اور انسانی وجود اور نشو و نما اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں۔ ایک انسان جس طرح وجود میں آتا ہے اور پھر جس طرح وجود کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اس میں قادر مطلق کا ارادہ، فیصلہ ہی کارفرما ہوتا ہے۔

تخلیق انسانی پر اگر ذرا غور کریں تو دیکھتے ہیں کہ ایک مرد سے بیک وقت کروڑوں تخم خارج ہوتے ہیں اور ہر ایک کے اندر بیضہ انثیٰ سے مل کر انسان بن جانے کی صلاحیت رہتی ہے مگر اس قادر مطلق کا فیصلہ ہی ہوتا ہے جو ان بے شمار کرموں سے کسی ایک کو کسی خاص وقت پر انتخاب

کر کے بیضہ انثٰی سے ملنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں استقرار حمل ہوتا ہے۔ اس کرم کے عورت کے بیضی خلیے (Egg cells) کے ملنے سے جو پہلی چیز بنتی ہے وہ اس قدر چھوٹی ہوتی ہے کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتی۔ یہ حقیر شئے 9 مہینے اور چند روز رحم کے اندر پرورش پا کر بے شمار مراحل سے گزر کر ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل اختیار کرتی ہے۔

ذرا یہ سوچیں کی کیا یہ سب ایک لگے بندھے قانون پر ہورہا ہے جسے ایک بے ارادہ فطرت چلا رہی ہے۔ بلکہ اگر سنجیدگی سے غور کریں، تدبر و تفکر کی راہ اختیار کریں تو ہرگز آپ کا دل اسے قبول نہیں کرے گا کہ یہ سب ایک اتفاقی عمل ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ان تمام عوامل کے پیچھے ایک حکیم فعال کا ارادہ کارفرما ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کسے تکمیل تک پہنچایا جائے اور کسے خون کے لوتھڑے یا گوشت کی بوٹی یا نا تمام بچے کی شکل میں ساقط کردے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کسے زندہ نکالنا ہے اور کسے مردہ، کسے معمولی انسان کی صورت و ہیئت دینی ہے، کسے غیر معمولی صورتیں دینی ہیں، کسے صحیح سالم نکالنا ہے اور کسے عیب دار بنانا ہے، کسے خوبصورت اور کسے بدصورت بنانا ہے۔ کسے مرد اور کسے عورت بنانا ہے۔ کسے ذکی و فہیم اور کسے کند ذہن بنانا ہے۔ تخلیق کا عمل جو ہر روز کروڑوں عورتوں کے رحم میں ہورہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی سے ہورہا ہے۔ اس دنیا میں انسان بچے کی شکل میں آتا ہے، پرورش پاتا ہے، جوانی کو پہنچتا ہے اور پھر ایک عمر پانے کے بعد اللہ تعالیٰ اُسے واپس بلا لیتا ہے۔ بلانے کا فیصلہ بھی وہی کرتا ہے۔ اس کے اسباب بھی وہی تعین کرتا ہے جن میں کوئی بیماری، حادثہ، قتل، خودکشی، کینسر، سکتہ، قلبی یا پھر قتل بجذبۂ رحم کی بھیک مانگ رہا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وقت کا بھی تعین وہی کرتا ہے۔

اس کرۂ ارض پر کوئی بھی انسان خواہ وہ کسی مذہب، کسی ملک یا کسی خطہ کا ہو خدائے بزرگ و برتر پر ایمان کامل رکھتا ہو یا نہ ہو مگر موت کا انکار نہیں کرسکتا۔

ہر شخص اس بات کو مانتا ہے کہ جو شخص اس دنیا میں آیا ہے وہ ایک نہ ایک روز ضرور موت کے منہ میں جائے گا اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ خواہ کتنا بڑا سائنس داں ہو، نجومی ہو اور دوسروں کی موت کی پیشن گوئی بھی کرتا ہو، مگر اسے اپنی موت کا دن اور وقت نہیں معلوم ہوتا۔

سورۃ المومنون میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ. ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ. ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ. ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ. ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ.

(ہم نے انسانوں کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوندوں میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے، پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے۔) (سورۃ المومنون، آیت: 13 تا 17)

قرآن تخلیق انسانی کے مختلف مراحل کو بیان کر کے اس سے اصلاً استدلال اس امر پر کرتا ہے کہ زندگی کے بعد آخرت اور بعث بعد الموت برحق ہے۔

ooo

موت
(DEATH)

''موت''!!

تین حروف کے اس لفظ کا نام سنتے ہی جسم و جاں میں کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو جاتی ہیں اور ایک انجانے خوف کا احساس ہونے لگتا ہے۔

موت برحق ہے اور موت کے بارے میں سب کا ایمان و یقین ہے کہ وہ ہر ذی جان انسان و حیوان کو آتی ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑے واضح اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت

(ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔) (سورۃ عنکبوت، آیت:57)

خدائے بزرگ و برتر پر کسی انسان کا یقین کامل ہو نہ ہو، آسمانی کتابوں، رسولوں، فرشتوں اور موت کے بعد زندگی کے بارے میں خواہ یقین ہو یا نہ ہو۔ وہ کیسا بھی دہریہ ہو، بے دین ہو مگر وہ اچھی طرح اور یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ موت آنی ہے جسے وہ اپنی مرضی سے روک نہیں سکتا اور نہ ہی وہ اس کے معینہ وقت کو ٹال سکتا ہے۔ موت تو آ کر ہی رہے گی۔

میں اپنی بات ''علم موت'' کے حوالہ سے شروع کرنا چاہتا ہوں چونکہ یہ ایک علم ہے اور

اس کی اہمیت بھی اتنی ہی ہے جتنی صحیح وسالم پیدائش کی۔ہم موت کو کتنا بھی آسان سمجھ لیں اور اس کی طرف توجہ نہ دیں لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

وہ قادر مطلق جس نے اپنی خواہش سے جہاں اس دنیا میں ہمیں بھیجا ہے اور دینی، دنیاوی، سماجی اور دوسری ذمہ داریاں عطا کی ہیں اس نے اس جہانِ رنگ و بو میں زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا ہے، وہی اپنی مرضی سے اور حکم سے دار فانی کو چھوڑ کر ابدی دنیا میں بلا لیتا ہے۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ اللہ تعالیٰ کی ان ہدایات پر انسان کتنا عمل پیرا ہوتا ہے اور آخرت کی کتنی کمائی کرتا ہے اور اپنا مقام آخرت میں کیا بناتا ہے مگر جس بے بسی، لاچاری کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو صرف اس کے اعمال ہی ساتھ جاتے ہیں۔ رشتے ناطے، عزیز و اقارب، بال بچے، اپنے پرائے، دوست و احباب، مال و متاع، زمین و جائیداد یہیں چھوڑ جاتا ہے اور وہ تن تنہا خالی ہاتھ مالک حقیقی سے جا ملتا ہے۔اس کے ساتھ اس کے اعمال صالحہ جاتے ہیں اور اس کے رخصت ہونے کے بعد اس کے اچھے کام یاد کیے جاتے ہیں۔

سعد یا مرد نیکو نام نمیرد ہرگز
مردہ آن است کہ نامش بہ نکوئی نبرند
(شیخ سعدی)

''علم موت'' (Thanatology) طبی دنیا میں ایک علم ہے اور سائنس کا ایک حصہ ہے۔ Thanos یعنی موت اور Logos یعنی سائنس۔

طبی لحاظ سے موت دو مراحل میں واقع ہوتی ہے۔

(1) جسمانی یا طبی موت (Somatic or Clinical Death)

(2) سالمی یا خلیاتی موت (Cellular or Molecular Death)

عام طور پر موت کا مطلب جسمانی موت ہی لیا جاتا ہے جس میں دماغ، دل اور پھیپھڑوں کا عمل کا مل رک جاتا ہے اور یہ اٹل اور ناقابل تنسیخ ہو جاتا ہے۔

کچھ دنوں قبل دل کی دھڑکنیں اور سانس کے رُک جانے کو موت کی نشانی سمجھا جاتا تھا لیکن جب سے دل کی پیوندکاری ممکن ہوئی تو بات دماغ کی کارکردگی سے جڑ گئی۔اب ان تینوں

اعضائے رئیسہ (Vital Organs) کے عمل کے رُک جانے پر ہی موت واقع ہوتی ہے۔ طبی سائنس کی پیش رفت نے موت کی تعریف (Definition) ہی بدل دی ہے۔

جنوری 2009 کی 12 تاریخ کے ٹائمز آف انڈیا کی خبر کے حوالہ سے ایک انسان 30 منٹ کی موت کے بعد بھی زندہ کیا گیا۔

دراصل ستر سالہ انٹونیو جو پرتگال کا شہری تھا اور جج کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد گوا میں چھٹیاں منانے آیا ہوا تھا۔ اس کے پیر میں اچانک درد ہوا اور اسپتال لے جانے پر تحقیق میں پتہ چلا کہ اس کے گردہ میں سرطان ہے جو دل کے قریب پہنچ چکا ہے اور جسم کے نچلے حصے یعنی پیر کی طرف خون واپس لانے والی رگ Inferior Venacava میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ یکم جنوری 2009 کو ممبئی کے ایک اسپتال میں آپریشن ہوا جس میں 17 سینٹی میٹر لمبا سرطان بخوبی نکال لیا گیا۔

آپریشن اپنے آپ میں ایک نہایت غیر معمولی آپریشن تھا جس میں مریض کے جسم کے خون کو 37^{O} سے $17^{O}C$ تک ٹھنڈا کیا گیا اور جسم سے سارا خون باہر نکال لیا گیا۔ ایسے میں لامحالہ طبی موت واقع ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں 45 منٹ کوئی انسان زندہ رکھا جاسکتا ہے۔ سرطان کو نکالنے میں 8 گھنٹے کا یہ اپریشن ہوا جس میں خون جسم سے باہر دو گھنٹہ رکھا گیا اور پھر 37.4^{O} لاکر دوبارہ جسم میں خون کا دوران شروع کیا جاسکا۔ ڈاکٹر آنند سومیہ کے ذریعہ ہوئے اس آپریشن کو کافی سراہا گیا۔

جسمانی یا طبعی موت کے بعد جسم کے سالمے اور خلیات دیر تک زندہ رہتے ہیں اور یہ آکسیجن کی فراہمی اور فراوانی پر منحصر کرتے ہیں۔ جب یہ سالمے اور خلیے بھی مرجاتے ہیں تو خلیاتی موت کہا جاتا ہے۔

عام طور پر عصبی نسیج (Nervous Tissue) جلد مرجاتے ہیں یعنی محض 5 منٹ میں لیکن عضلات (Muscles) 3 سے 4 گھنٹے زندہ رہتے ہیں۔

خلیاتی موت کی پہچان جسم کا سرد ہونا ہے۔ ساتھ ساتھ آنکھوں، جلد اور عضلات میں بھی تغیر اور تبدیلی دکھائی دینے لگتی ہے اور یہ سارا عمل 3 سے 4 گھنٹوں تک چلتا رہتا ہے۔

اکثر موت کی تشخیص مشکل مسئلہ بن جاتا ہے، خاص کر

(1) جب موت کے بعد دیر تک جسم گرم رہے

(2) حرکت، جوش سرد ہونے (Suspended Animation) کی حالت

(3) کوما۔ خاص کر خواب آور دواؤں کے زیادہ مقدار میں استعمال سے

(4) عمر رسیدہ لوگوں میں درجہ حرارت جسم کے طبعی درجۂ حرارت سے کم ہو۔

(5) بجلی کے گرنے یا بجلی کی کرسی پر بٹھانے کے بعد۔

(6) غرقابی خصوصاً ٹھنڈے پانی میں غرقابی

قانونی مسئلہ درپیش ہو جائے تو جسمانی اور خلیاتی موت کی شناخت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے:

(1) جلد تجہیز و تکفین کرنا ہو۔

(2) اعضا کی پیوندکاری کے لیے اعضا نکالتے وقت

لہٰذا واقعی موت کی شناخت ضروری ہے، چونکہ جسمانی موت کے بعد کبھی ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ تجہیز و تکفین کی تیاری کے دوران یا اس کے بعد بھی ہاتھ اور پیر میں حرکت ہو جاتی ہے اور مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔

اعضا کی پیوندکاری کے لیے جسم کے مختلف اعضا کے نسیج ایک ساتھ نہیں مرتے بلکہ ان میں بھی فرق ہے۔ اسی لیے ہر عضو کا مدت استعمال بھی پیوندکاری کے لیے مختلف ہے۔

جگر : پندرہ منٹ کے اندر جدا کر لینا چاہیے۔

گردہ: پینتالیس منٹ

دل : ایک گھنٹہ میں

آنکھ : چھ گھنٹے کے اندر ہی جدا کر لینی چاہیے۔

اگر کسی کے دماغ میں چوٹ آجاتی ہے تو دورانِ خون (آکسیجن) مصنوعی طریقے سے کافی دیر تک زندہ رکھا جا سکتا ہے اور ایسی حالت میں مختلف ردعمل کی جانچ کے بعد ہی قانونی طور پر مردہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر پیوندکاری کے لیے جس عضو کی ضرورت ہے وہ فوراً ہی نکال لیا جاتا ہے۔

موت کے اسباب خواہ جو بھی ہوں اموات کے عموماً تین انداز (Modes) ہیں۔

(1) بیہوشی یا غیر طبعی نیند (Coma)

اس میں ہوش کا مکمل ضیاع ہو جاتا ہے اور دماغ کا فعل کمزور ہو جاتا ہے اور بیہوشی طاری

ہوجاتی ہے۔اس کا سبب دماغ کے اندر کے دباؤ کا بڑھنا یا دماغ میں چوٹ لگنا ہوسکتا ہے یا پھر زہریلے مادّے خصوصاً افیون سے بنی دوائیں یا خون میں Urea کی زیادتی جیسے اسباب ہوسکتے ہیں۔

(2) شدید ضعف(Syncope):

طاقت کا اچانک ضیاع اور معمولی بیہوشی جیسی حالت کو Syncope کہتے ہیں۔اس میں خون کی نمایاں کمی ہوجاتی ہے اور دل کا فعل رک جاتا ہے۔

دماغ میں آکسیجن کی کمی ہوجاتی ہے جس کا سبب

☆ قلبی بیماری

☆ خون ریزی

☆ خون کے خلیوں میں تغیر

☆ بعض موذی اور خطرناک بیماریاں

☆ سمومیت(Poisoning)

مرنے کے بعد معائنہ نعش میں پتہ چلتا ہے کہ قلب میں سکڑن پیدا ہوجاتی ہے اور خون ریزی کے سبب موت واقع ہوتی ہے تو دل میں خون بہت کم ملتا ہے۔

(3) اختناق (Asphyxia):

جس میں سانس گھٹنے یا بند ہوجانے سے مرکز تنفس (Respiratory Centre) ناکارہ ہوجاتا ہے اور موت واقع ہوجاتی ہے۔

اختناق سے موت واقع ہونے کی وجوہات میں:

☆ نمونیہ

☆ مرکز تنفس کا شلل

☆ سانس کی نلی میں رکاوٹ

☆ چوٹ سے سانس رک جانا

معائنہ جسد سے اس کی تشخیص اس طرح ہوتی ہے کہ جسم نیلا پڑ جاتا ہے اور بالکل ہی چھوٹے ذرّات کے مانند خون کے دھبے جسم پر دکھائی دیتے ہیں اور قلب میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔

ناگہانی موت (Sudden Death):

ناگہانی موت نام سے ہی عیاں ہے جو طویل علالت کے بعد نہیں بلکہ جھٹ پٹ حالت بگڑی اور موت واقع ہو جاتی ہے۔ ایسی موت کی اہمیت طبی قانون (Medical Jusriprudencc) کے لحاظ سے اہم اس لیے ہو جاتی ہے چونکہ کسی سازش کا احتمال ہو سکتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ انسان بھلا چنگا دکھے لیکن اسے داخلی بیماری ایسی ہو جس سے وہ خود بے خبر ہو اور موت اچانک واقع ہو جائے اور عزیز و اقارب کا شک خودکشی یا قتل کی طرف چلا جائے۔ لہٰذا طبی قانون کے حساب سے اچانک موت صرف نعش کی بیرونی جانچ یا معائنہ سے اور پوسٹ مارٹم (Autospy) سے ہی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ معائنہ ہر زاویے سے لازم ہوتا ہے چونکہ موت غیر طبعی ہوتی ہے۔

اچانک موت کے اسباب کی فہرست طویل ہے لیکن ممکنہ اسباب میں:

☆ قلبی و عروقی (Cardio Vascular)
☆ تنفسی (Respiratory)
☆ مرکزی نظام عصبی (Cenrtal Nervous System)
☆ شکمی (Abdominal)
☆ درون افروزی (Endocrinal)
☆ متفرقات (Miscelleneous)

جیسے اسباب عام طور پر ہوتے ہیں۔

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے، رم کے سوا کچھ بھی نہیں
(اقبالؔ)

OOO

موت کی نشانیاں
(SIGNS OF DEATH)

موت کی حقیقت فنا ہونا نہیں ہے بلکہ اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونا ہے۔ اسی لیے موت کی جگہ انتقال بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے موت کے وقت گرچہ روح انسانی جسم سے نکل جاتی ہے مگر بزرگوں کا قول ہے کہ روح کا تعلق بدن سے قائم رہتا ہے، اور مردہ اسی تعلق کے باعث راحت یا عذاب قبر کا احساس وادراک کرتا ہے، گو دوسرے انسان عام طور پر مردے کی اصل کیفیت اور روح وجسم کے تعلق سے ناواقف ہوتے ہیں۔

میں اس بحث کو فی الوقت موضوع نہیں بنانا چاہتا مگر ایک مسلمان طالب علم کی حیثیت سے علم موت یعنی Thanatology کا مطالعہ کرتا ہوں اور اسلامی نقطہ نظر کو سامنے رکھتا ہوں تو کئی باتیں آشکارا ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُo

(بڑی برکت والا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں بادشاہی ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے بنایا موت اور زندگی کو تا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں کون اچھا عمل کرتا ہے، اور وہ زبردست اور بخشنے والا ہے۔)

(سورۃ الملک، آیت: 1 تا 2)

موت تو برحق ہے اور موت کے وقت یا موت کے بعد جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اس پر غور وفکر کرنا ضروری ہے۔

وَجَاءَ سکرۃُ الموت بِالحَقِ ذَالِکَ مَا کُنتَ منہُ تَحیدُ

(اور تحقیق کہ آ پہنچی بیہوشی موت کی۔ یہ وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا تھا۔)

سکرات کی اصطلاح سے ہم سب واقف ہیں اور ہم میں سے اکثر لوگوں نے بزرگوں، عالموں کے بیانات اور خطبات میں سنا ہوگا اور اب جب کلام اللہ میں بھی پڑھتے ہیں تو اسے بھی سمجھ لینا چاہیے۔

دراصل سکرات روح نکلنے سے پہلے کی وہ حالت ہے جس میں انسان پر ایک نشہ سا چھا جاتا ہے اور بیہوشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ بزرگان فرماتے ہیں کہ روح کے جسم سے نکلنے کا یہ وقت ہوتا ہے۔ ان حالات میں انسان کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور اس حالت کو "عالم نزع" بھی کہتے ہیں اور جان کنی بھی کہا جاتا ہے۔

سکرات کی سختی کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے پیارے نبیؐ پر بھی سکرات کا وقت آیا اور آپؐ پر بار بار غشی طاری ہونے لگی، تو حضرت فاطمہ زہراؓ دیکھ نہ سکیں اور چیخ پڑیں:

"واکرب اباہ" (ہائے میرے ابا کی بے چینی)

اور حضور اقدس کو اس عالم میں بھی انھیں دلاسا دینا پڑا کہ تمھارے ابا آج کے بعد پھر کبھی بے چین نہ ہوں گے۔

بزرگان فرماتے ہیں کہ رسول پاکؐ پاس میں پانی کی لگن میں ہاتھ ڈالتے اور چہرۂ مبارک پر ملتے اور فرماتے:

اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ عَلٰیٓ سَکَرَاتِ الْمَوْتِ

(ترجمہ: الٰہی مجھ پر موت کی سختی آسان فرما)

پھر آپؐ نے بائیں انگلی اوپر اٹھائی اور فرمانے لگے:

''فِی الرّفیق الا علیٰ..... فی الرفیق الاعلیٰ''

(ترجمہ: سب سے اعلیٰ اور برتر رفیق کے پاس)

یہاں تک کہ روح مبارک نے عالم بالا کا رخ کیا اور آپ کا دست مبارک پانی میں ایک طرف جھک گیا۔اِنا للّٰہ و اِنا اِلَیْہِ رٰاجِعُون٥

علما فرماتے ہیں کہ سکرات کی پہچان ہے کہ جسم کی تمام رگیں کھنچنے لگتی ہیں، رنگ بدل کر مٹیالا ہو جاتا ہے، ناک ٹیڑھی ہو جاتی ہے، آنکھ کے ڈھیلے اوراوپر چڑھنے لگتے ہیں، حلق اور سینے سے گھڑ گھڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی ہے، ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں، ہاتھ، پاؤں سرد اور بے حس ہونے لگتے ہیں۔ایسے حالات یا اس سے ملتے جلتے حالات پیدا ہوں تو یہ موت کا پتہ دیتے ہیں۔

یہ تو واقعات اور کلام اللہ کے حوالہ سے باتیں ہوئیں لیکن مماتیات (Thanatology) کے ماہرین موت کے آثار اور جسم میں ہونے والے تغیرات کو کس طرح بیان کرتے ہیں اور سائنسی نقطۂ نظر سے موت کے بعد کی تبدیلیاں کس طرح بیان کی جاتی ہیں۔

موت کے آثار (Signs) کو سمجھنے کے لیے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) فوری Immediate

(۲) جلدی Early

(۳) دیر سے Late

فوری آثار میں طبی موت کو شمار کیا جاتا ہے اور اس کے بعد جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ موت کے 12 سے 24 گھنٹے کے بعد شروع ہوتی ہیں جو سالمی یا خلیاتی موت شمار کی جاتی ہے۔

اور پھر دیر سے تبدیلی تقریباً 24 گھنٹے کے بعد ہی شروع ہو پاتی ہے جسے Decomposition یا Decay یعنی سڑنا گلنا کہتے ہیں یا پھر اس تبدیلی سے پہلے ممیائی Mummification ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ طبی موت کی شناخت کیسے کی جا سکتی ہے اور اس کا یقین کیسے ہو سکتا ہے کہ موت واقع ہو گئی ہے۔یہ بات پہلے آ چکی ہے کہ دل و دماغ اور تنفس کے رک جانے سے ہی موت واقع ہوتی ہے۔لہٰذا ان تینوں نظاموں یعنی دماغ، دل اور پھیپھڑے کی کارکردگی کے رکنے کا یقین کیسے ہو اس لیے EEG یعنی Electroencephalogram کی مدد لی جاتی ہے۔زندہ

انسان میں دماغی ترنگیں (Waves) موجود ہوتی ہیں جو مردہ میں ساقط ہو جاتی ہیں۔ نیز حرکت قلب اور دوران خون باحیات انسان میں جاری رہتا ہے لیکن ایک مردہ انسان میں رک جاتا ہے جسے E.C.G یعنی Electrocardiogram کے ذریعہ پتہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح عمل تنفس Respiration بھی اسٹے تھوسکوپ سے پرکھا جاتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر موت کی تصدیق کے لیے EEG یا ECG کیا جائے بلکہ معمولی ردعمل اور مختلف احساسات کا اندازہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے جیسے جسم کو چھو کر لمس کا احساس، جسم میں درد کا احساس، درجہ حرارت اور حکم کے باوجود حرکت نہ ہونا وغیرہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، چونکہ مردہ انسان میں سارے ردعمل ختم ہو جاتے ہیں۔

مگر بعض وقت دھوکہ بھی ہوسکتا ہے جیسے کسی شخص کو بار بار بیہوشی کا دورہ پڑتا ہو، مرگی، غرقابی یا بجلی کے جھٹکے کے بعد موت کی یا مردہ کی سی کیفیت پیدا ہو جائے مگر اکثر ان حالات میں کاملاً صحت یابی ممکن ہے۔

اگر ذرا بھی شک پیدا ہو تو EEG کیا جاسکتا ہے اور لگاتار پانچ منٹ تک کوئی ترنگیں نہ دیکھیں تو موت یقینی واقع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح اسٹے تھواسکوپ سے دل کی آواز پانچ منٹ تک لگاتار سننے پر غائب ہو تو موت ہی سمجھنا چاہیے۔ لیکن قلب نہایت نحیف ہو چکا ہو یا کسی صحت مند انسان کا سینہ کافی چوڑا ہو تو پھر آواز سننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ شک کی حالت میں ECG یعنی الکٹروکارڈیوگرافی فیصلہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر ECG کی ترنگیں غائب ہو جائیں اور لگاتار پانچ منٹ تک خط مستقیم دکھائی دے تو وہ قابل یقین ہے۔

اکثر دل کی دھڑکن اور سانس کی آمد و رفت کو کچھ دیر روکا جاسکتا ہے جیسے کہ بعض ماہرین یوگا یا رشی منی کرتے ہیں جسے Suspended Animation یعنی جوش و جذبہ کا معلق ہونا کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں تنفس اور دل کی ڈھرکنوں کو نہایت خفیف بنا کر رکھ لیتے ہیں اور طبی امتحان کے ذریعہ شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ بعض شعبدہ بازوں کو اس میں مہارت ہوتی ہے۔ اس حالت میں ظاہراً موت دکھائی دیتی ہے یعنی Apparent Death لیکن وہ شخص حقیقت میں زندہ ہوتا ہے۔

روزمرہ کی عام زندگی میں بھی ایسے حالات دیکھنے کو ملتے ہیں جیسے کوئی پانی میں ڈوبا ہو اور بچالیا گیا ہو نوزائیدہ، عمل جراحی کے لیے بیہوشی کے بعد کے حالات، سر میں فوراً چوٹ کے بعد کا

صدمہ (Concussion) بجلی کے جھٹکے کے بعد، لو لگنے سے، طویل مرض جیسے میعادی بخار، خواب آور دواؤں کا استعمال، گہرے صدمہ سے بھی ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے میں دوبارہ ہوش میں لایا جاسکتا ہے یعنی Resuscitate کیا جاسکتا ہے اور بحالی زندگی ممکن ہوتی ہے۔

ان حالات میں EEG یا ECG جیسی مشینوں کا استعمال کر کے موت کی تصدیق کی جاتی ہے۔

سانس رکنے کا عمل:

بغیر موت کے بھی سانس اکثر رک جاتی ہے یا اسے روکا جاسکتا ہے جس کا مشاہدہ ان نوزائیدہ بچوں میں کیا جاسکتا ہے جو روتے روتے کچھ دیر کے لیے سکتے میں چلے جاتے ہیں۔ پانی میں ڈوبنے کے بعد یا کوئی اپنی خواہش سے بھی سانس روک سکتا ہے۔ مگر اسٹےتھواسکوپ کو سینے کے اوپری حصوں پر رکھ کر نحیف سے نحیف آواز بھی سنی جاسکتی ہے۔ اگر پانچ منٹ تک لگا تار کوئی آواز سنائی نہ دے تو یقیناً موت کی تصدیق ہوسکتی ہے۔

سالمی یا خلیاتی موت کی علامت:

سالمی یا خلیاتی موت کی علامت 12 سے 24 گھنٹوں کے بعد شروع ہوتی ہے جس میں:

(1) جسم سرد ہوجاتا ہے۔

(2) آنکھوں میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

(3) جلد میں تغیرات ہوتے ہیں

(4) جسم نیلگوں ہوجاتا ہے

(5) عضلات میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

جسم کا سرد پڑنا:

جسم کے سرد پڑنے کو Algormortis یعنی (سرد=Algor اور موت کے بعد=Mortis) بھی کہا جاتا ہے۔

زندہ انسان میں جسم کے اندر حرارت کے بننے اور ضائع ہونے کے درمیان ایک توازن قائم رہتا ہے لیکن موت کے بعد حرارت بننے کا عمل ساقط ہوجاتا ہے اور جسم کی گرمی Conduction,

Convection اور Radiation کے ذریعہ نکلنے لگتی ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ ماحول کے درجہ حرارت کے مساوی نہ ہوجائے۔ جسم کی حرارت کے ختم ہوجانے سے موت کی ابتدائی شناخت ہوجاتی ہے۔ درجہ حرارت سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موت کتنی دیر قبل واقع ہوئی ہے۔

عام طور پر موت کے فوراً بعد ہی جسم کے درجہ حرارت میں کمی ہونے لگتی ہے لیکن بعض شدید بیماریوں میں دوران خون کی کمی کی وجہ سے موت سے قبل ہاتھ اور پیر میں ٹھنڈک محسوس کی جاسکتی ہے اور یہ ٹھنڈک دھڑ پر بعد میں پہنچتی ہے۔

ہندوستان ایک گرم سیر ملک ہے لہٰذا جسم سے درجہ حرارت 5-7°C فی گھنٹہ کم ہوتا ہے اور ماحول کے مطابق جسم کا درجہ حرارت پہنچتے پہنچتے 16-20 گھنٹے لگتے ہیں۔

کچھ ایسے حالات بھی ہوتے ہیں جس میں درجہ حرارت نہ گرنے یا موت کے بعد زیادہ ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ ان میں لولگنا اور دماغ کے مخصوص حصہ میں خون ریزی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ موت سے قبل درجہ حرارت کا مشینی عمل درہم برہم ہوجاتا ہے۔

دوسری حالت کزاز (Tetanus) یا سمومیت (Poisoning) ہوتی ہے جس میں عضلات کا درجہ حرارت بڑھنے لگتا ہے۔

جراثیمی اور وائرل بخار، نمونیا، میعادی بخار اور دماغی بخار میں بیکٹیریا اور وائرس بے حد فعال ہوجاتے ہیں اور ایسے درجہ حرارت کو Postmortem Calonicity کہا جاتا ہے۔ تیز بخار کے بعد درجہ حرارت پھر رفتہ رفتہ کم ہونے لگتا ہے۔

آنکھوں میں تبدیلی:

آنکھوں کے شیشہ (قرنیہ) میں جو چمک عام انسانوں میں موجود ہوتی ہے وہ موت کے بعد مندمل ہونے لگتی ہے اور قرنیہ سوکھنے لگتا ہے پھر دھندلا ہوکر بالکل ہی غیر شفاف ہوجاتا ہے۔ چونکہ قرنیہ پر چمک پیدا کرنے والی شئے آنسو کا بننا رک جاتا ہے۔

آنکھوں پر روشنی ڈالنے سے اس کا ردعمل بھی ختم ہوجاتا ہے۔ یعنی آنکھوں کی پتلی کا سکڑنا بھی ختم ہوجاتا ہے۔ آنکھوں کے داخلی حصہ کا دباؤ کم ہوجانے سے آنکھیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں

اور آنکھیں دھنسی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ آنکھوں کی پتلیاں پہلے تو پھیل جاتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ دوبارہ سکڑنے لگتی ہیں۔

جلد میں تبدیلیاں:

موت کے بعد جلد کا رنگ پھیکا، خاکستری، سفیدی مائل ہو جاتا ہے اور صاف رنگ کے لوگوں پر یہ زیادہ نمایاں رہتا ہے۔ جلد کا لچیلا پن بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ہونٹ خشکی کی وجہ سے گہرے رنگ کے ہو جاتے ہیں۔

عضلات میں تبدیلیاں:

عضلات کے نسیج موت کے بعد تین مراحل سے گزرتے ہیں:

(1) ابتدا میں ڈھیلا پن(Flaccidity)

(2) پھر پورے دھڑ میں سختی (Rigormortis)

(3) اور آخر میں پھر ڈھیلا پن (Relaxation)

(1) ابتدائی ڈھیلا پن:

موت کے فوراً بعد، عام عضلات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے نیچے کا جبڑا کھل جاتا ہے، ناک مڑ جاتی ہے اور منہ کھل جاتا ہے۔ آنکھوں کی پتلی پھیل جاتی ہے۔ عضلات بالکل نرم اور جھول جاتے ہیں۔ جسم کے جوڑوں کو موڑا جا سکتا ہے اور عاصرے یعنی Shphincters بھی ڈھیلے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بول و براز نکل آتے ہیں۔

چونکہ سالمی موت 4-3 گھنٹے تک نہیں ہوتی اس لیے مشینی، کیمیائی اور برقی محرکات اثر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

(2) پورے دھڑ میں سختی:

موت کے بعد یہ وہ تبدیلی ہے جس میں عضلات سکڑ جاتے ہیں اور ڈھیلا پن ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے جسم کے اندر عضلات کے پروٹین میں کیمیائی تبدیلی ہوتی ہے اور رائیگر مورٹس کے رونما ہوتے ہی سالمی یا خلیاتی موت کی تصدیق کی جاتی ہے۔

جسم کے تمام عضلات خواہ وہ اختیاری (Voluntary) یا غیر اختیاری (Involuntary) ہوں، ان میں سختی نمایاں ہوتی ہے۔

غیر اختیاری عضلات میں سب سے پہلے سختی قلبی عضلہ میں پیدا ہوتی ہے لیکن اختیاری عضلات میں آنکھوں کے عضلات 4-3 گھنٹے، چہرے کے عضلات 5-4 گھنٹے، گردن اور چھاتی کے عضلات 7-5 گھنٹے، ہاتھوں میں سختی 9-7 گھنٹے، پیروں میں 11-9 گھنٹے اور سب سے آخر میں انگلیوں کے چھوٹے عضلات 12-11 گھنٹے میں سخت ہوتے ہیں اور یہ سختی ختم بھی اسی ترتیب سے ہوتی ہے۔ چونکہ عضلات کے پروٹین میں Autolysis ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں رائیگر مورٹس 3-2 گھنٹے میں شروع ہو کر 12 گھنٹوں میں تکمیل کو پہنچتا ہے اور 12 گھنٹے رہتا ہے اور مزید 12 گھنٹے اسے ختم ہونے میں لگتے ہیں۔ رائیگر مورٹس کی اہمیت طبی قانون کے لحاظ سے اہم ہے چونکہ اس سے تین اہم معلومات ظاہر ہوتے ہیں۔

(1) موت کے آثار میں سے ایک ہے۔

(2) موت کے واقع ہونے کا وقت پتہ چلتا ہے۔

(3) موت کے وقت جسم کس حالت میں تھا۔

(3) ثانوی ڈھیلا پن (Secondary Relaxation):

جسم میں موت کے بعد کی سختی ڈھیلے پن میں بدل جاتی ہیں جس میں عضلات نرم ہو جاتے ہیں اور جھول جاتے ہیں مگر مشینی یا برقی ردعمل نہیں رہتا مگر کیمیائی عمل الکلائین ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رائیگر مورٹس یعنی موت کے بعد کی سختی موت کے فوراً بعد ہی عیاں ہو جاتی ہے جیسے نہایت سرد حالات میں یا نہایت گرم حالات میں جمنے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یا پھر جسم میں سختی سڑاند پیدا کرنے والی گیس کے نسیجوں میں اکٹھا ہونے سے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور مختلف حالت Cadaveric Spasm کی بھی ہوتی ہے جو موت واقع ہونے کے فوراً بعد پائی جاتی ہے۔ گرچہ یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے مگر ممکن ضرور ہے۔ خاص کر جب حقیقی موت تیزی سے ہوئی ہو اور وہ شخص انتہا درجہ کے جذباتی ماحول سے گزر رہا ہو اور اس کے عضلات موت کے وقت فعال ہوں۔ ○○○

موت کے بعد
(AFTER DEATH)

موت کے بعد کے حالات قلم بند کرنے کے لیے کئی بار بیٹھا مگر ہر بار دل ودماغ کی کیفیت کچھ ایسی ہوئی کہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ لکھنے کو تو ملتوی کرسکتا ہوں، چونکہ یہ ہمارے بس میں ہے لیکن موت!!! انسان کے بس میں نہیں۔ یہ تو اٹل ہے۔

یقیناً یہ احساس تکلیف دہ ہے کہ ایک دن میں اپنی جانی پہچانی دنیا سے جلاوطن کر کے انجان دنیا میں چلا جاؤں گا اور میرا اور اپنے تعمیر اور تسخیر کردہ جہان سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اس منفی احساس کو مکمل طور پر حاوی کرنے کے بعد اس سے جنم لینے والی افسردگی، بے چارگی اور بے بسی اتنی شدید محسوس ہوتی ہے کہ نہ پوچھیں۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

مگر اس ذہنی سمجھوتہ کے بعد اس کال کوٹھری کا جب خیال آتا ہے تو دل پژمردہ ہو جاتا ہے اور بے کیفی کا احساس شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ زندگی کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ موت کے بعد کے حشر کا تو کم ہی لوگوں نے سوچا ہوگا۔

اعزا و اقارب، دوست واحباب، اپنے ناطے بڑے اہتمام اور احترام کے ساتھ لوبان و کافور کی خوشبو میں لپیٹ کر کاندھوں پر گور غریباں پہنچا دیتے ہیں اور اس لامتناہی رسم کا پاس رکھتے ہوئے دو گز تنگ زمین کے نیچے دفن کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کافور و لوبان، عطر، گلاب و کیوڑہ کی خوشبو میں اپنے عزیز کو محفوظ جگہ رکھ آئے اور شاید روز محشر اسی عالم میں اٹھایا جائے گا۔

مگر قبر کا حال تو مردہ ہی جانتا ہے

جو اللہ والے ہیں وہ مردہ کے گناہوں کی بخشش کی دعا کرتے ہیں اور قبر کی مشکلات کو آسان فرمانے کی دعا کرتے ہیں۔ اعزا و اقارب کئی روز غمزدہ رہ کر وقت کا مرہم استعمال کر کے بھول جاتے ہیں۔ بقول اکبر الہ آبادی۔

بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا

صوفیا اور معلمین اخلاق بار بار یہ احساس دلاتے رہیں گے کہ۔

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

میں دراصل موت کے بعد جسم میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کر رہا تھا اور 24 گھنٹے کے اندر ہونے والے تغیرات کا ذکر کر رہا تھا لیکن آج میں 24 گھنٹے کے بعد جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، اس کا ذکر کروں گا۔

موت کے بعد دیر سے واقع ہونے والے آثار میں جو اکثر 24 گھنٹوں کے بعد ہی شروع ہوتا ہے، ان میں

(1) گلنا (Decomposition) اور سڑنا (Decay) ہوتا ہے جس میں شناخت تعفن (Putrifaction) سے ہوتی ہے۔
(2) فربہی (Adipocere Formation) یا ایسٹر کی آب پاشیدگی (Saponification) اور
(3) مومیائی حالت (Mummification) سے ہوتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جب تعفن کا عمل ایک مقام پر رک جاتا ہے اور جسم کے شحمی نسیج، تیزاب (Fatty Acid) میں بدل جاتے ہیں جسے Adipocer Formation کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یا پھر جسم کے نسیج (Tissue) خشک ہوجاتے ہیں اور یہ حالت مومیائی (Mummification) کہلاتی ہے۔

اور یہ بھی کبھی ہوتا ہے کہ دونوں قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں یعنی جسم کا بعض حصہ Adipoccr بنتا ہے تو دوسرا حصہ Mummify ہوجاتا ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ تعفن (Putrifaction) کا عمل کیونکر ہوتا ہے؟

دراصل گلنے اور سڑنے کا عمل جراثیم کے ذریعہ نامیاتی مادے (Organic Matter) کی تباہی سے شروع ہوتا ہے اور اس عمل میں دو رد عمل ہوتا ہے۔

(1) خود پاشی (Autolysis) یعنی خامرات کی موجودگی کے نتیجے میں حیاتی خلیوں کا تباہ ہونے کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔

(2) جراثیمی عمل (Bacterial Action) جس میں بیکٹیریا کے علاوہ ہوا پاش جرثومے اور فطر (Aerobic Fungi)، کیڑے مکوڑوں کے لاروے (Insect Larvae)، نخر حونیات (Protozoa) اور دیگر کیڑے مکوڑے بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔

خود پاشی (Autolysis) سے مراد یہ ہے کہ جب جسم کے نسیج (Tissue) مر جاتے ہیں جیسے سکتہ قلبی (Heart Attack) میں Lytic خامرے کی مقدار مقامی طور پر بڑھ جاتی ہے۔ جسم کے دوسرے نسیجوں سے بھی خامرے نکلتے ہیں جو جسم کے نسیجوں کو نرم اور آبی بنا دیتے ہیں۔ یہ عمل تو موت کے 4-3 گھنٹے بعد ہی شروع ہوتا ہے اور دو سے تین دن تک قائم رہتا ہے۔

اُدھر جراثیمی عمل (Bacterial action) میں بھی بیکٹیریا کثرت سے خامرے بناتے ہیں جو نشاستہ، شحم اور لحمیے پر کام کرتے ہیں۔ لہٰذا موافق حالات جیسے گرمی، رطوبت، ہوا جرثوموں کے پھلنے پھولنے، پنپنے اور بڑھنے میں سازگار ثابت ہوتے ہیں جس سے سڑاندھ میں تیزی آتی ہے۔

خورد بینی بیکٹیریا جو سڑاندھ کے ذمہ دار ہوتے ہیں وہ ہواباش (Aerobic) اور غیر ہواباش (Anaerobic) دونوں ہی قسم کے ہوتے ہیں جن میں قابل ذکر Clostridiun Welchi، Streptococci، Escheresia Coli اور B-Proteus ہوتے ہیں جن میں سب سے زیادہ سڑاندھ پیدا کرنے والا کلوسٹریڈیم ہوتا ہے۔ یہ Lecithinase نام کا خامرہ پیدا کرتا ہے جو خلیوں کی جھلی میں نیز خونی خلیوں میں موجود Lecithin کی آب پاشی میں معاون ہوتا ہے۔ لہٰذا نہ صرف آب پاشی (Hydrolysis) بلکہ خون پاشی (Haemolysis) بھی ہوتی ہے جس کی وجہ سے سڑنے اور گلنے کا عمل شدت اختیار کر لیتا ہے۔

کسی انسان کی زندگی میں یہ جرثوے بڑی آنت میں کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن موت کے فوراً بعد خون کے رگوں میں داخل ہو کر سارے جسم میں پھیل جاتے ہیں۔

ان اعضا میں جس میں خون کی کثیر مقدار میں دوران ہے اور جو بیکٹیریا کے نزدیک ہیں ان میں سڑاندھ پہلے شروع ہوتی ہے۔

موسم گرما میں سڑاندھ کی ترتیب یوں ہے:

(1) رنگ میں تبدیلی

(2) نہایت بدبودار گیس کا بننا

(3) ان بدبودار گیس کا دباؤ

(4) کیڑے مکوڑوں Maggots کا نمودار ہونا

(5) اور دوسری تبدیلیاں

رنگ میں تبدیلی:

تعفن یا سڑنے گلنے کے عمل میں جس میں نامیاتی مادّے (Organic Matter) جراثیم کے ذریعہ تباہ ہونے شروع ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں سب سے پہلے جسم کی رنگت بدلنا شروع ہوتی ہے۔

رنگ میں تبدیلی 24-12 گھنٹے کے درمیان پہلے پہل بازو کے اندرونی حصے اور پیٹ کے نچلے حصے میں نمایاں ہوتی ہے جو سبز یا سیاہی مائل ہوتی ہے۔ چونکہ سلفامٹ ہیموگلوبین

(Sulphamethaemoglobin) بننا شروع ہوجاتا ہے اور جراثیم کی وجہ سے خون میں خون پاشی ہونے لگتی ہے۔ خون کا ہیموگلوبین ہائیڈروجن سلفائیڈ کے اثر سے (Sulphamethaemoglobin) بناتا ہے۔

رنگوں میں تغیر رفتہ رفتہ پیٹ کے سامنے اور بیرونی اعضا تناسل تک بڑھنے لگتا ہے اور دھبے کی شکل میں چھاتی، گردن، چہرے، بازو اور پیروں پر پھیلنے شروع ہوجاتے ہیں اور یہ سارے دھبے 24 گھنٹے کے اندر آپس میں مل کر پورے جسم کا رنگ بدل دیتے ہیں

اور تب گردن اور وہاں سے کاندھوں کی طرف اور پیڑو کی طرف رگیں نیلی یا سبز رنگ کی لائن کی شکل میں دکھنے لگتی ہیں جو رفتہ رفتہ سارے جسم میں پھیل جاتی ہیں اور جسم جیسے رگوں کے جال میں بُنا نظر آتا ہے اور آخر میں کامل جسم موزائیک سے بھرا دِکھنے لگتا ہے جسے Marbling کہتے ہیں۔ ماربلنگ گرچہ موت کے 24 گھنٹے بعد ہی دکھائی دے سکتی ہے لیکن 36 سے 48 گھنٹوں میں پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔

تعفن کا گیس:

رنگ میں تغیر کے ساتھ ساتھ ہائیڈروجن سلفائیڈ، امونیا، فاسفورے ٹڈ ہائیڈروجن اور میتھین جیسی گیسوں کا رساؤ جسم سے ہونے لگتا ہے اور نہایت شدید بدبو پھیلنے لگتی ہے۔ جلد کے نیچے خالی اعضاؤ شکم اور رفتہ رفتہ آنتوں میں بھی گیس جمع ہونے لگتی ہے اور شکم پھولنے لگتا ہے۔

18 سے 36 یا 48 گھنٹوں میں گیس کثیر مقدار میں جمع ہوجاتا ہے اور گیسوں کے جماؤ سے جسم ہلکا ہوجاتا ہے اور اگر پانی میں ہو تو پانی پر تیرنے لگتا ہے۔

سڑانڈھ والی گیس کے سبب پیدا ہونے والے دباؤ کا اثر:

گیس کا بڑھتا دباؤ حجابہ (Diadhragm) کو اوپر دھکیل دیتا ہے جس کی وجہ سے پھیپھڑوں اور دل میں سکڑن پیدا ہوجاتی ہے اور جسم کی خالی جگہ آبی نسیجوں میں گیس پھیلنے لگتی ہے اور تب جسم بالکل ہی پھول جاتا ہے جس کے نتیجے میں جسم اتنا پھیل جاتا ہے کہ مرتے وقت جو شکل تھی وہ باقی نہیں رہ جاتی، جلد، بال اور کوئی زخم اگر ہو تو ان سب میں تبدیلی آجاتی ہے۔

منہ اور ناک سے مائع مادہ خارج ہونے لگتا ہے۔ دل خالی ہو جاتا ہے اور اعضا تناسل میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

ہیئت میں تبدیلی:

36 سے 48 گھنٹوں میں چہرہ سوج جاتا ہے اور رنگت بھی بدل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ شناخت ناممکن ہو جاتی ہے۔ چونکہ ہونٹ، ناک، پپوٹے اور گال سبز غباروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آنکھیں کاسۂ چشم سے باہر کو نکل آتی ہیں، زبان سیاہ ہو جاتی ہے اور دانتوں کے درمیان سے باہر نکل آتی ہے۔ زبان کے نکلنے اور ناک منہ سے سرخ مواد نکلنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا ہو۔

جسم کے دوسرے اعضا کا حشر بھی بڑا ہی بھیانک ہو جاتا ہے۔ عورتوں کی چھاتیاں بے انتہا پھول جاتی ہیں اور 72-48 گھنٹوں میں مقعد بھی باہر نکل آتا ہے۔ ان حالات میں اگر شکم پر کوئی نوکیلی شئے لگ جائے تو جسم کی گیس خوفناک آواز کے ساتھ باہر نکل آتی ہے۔

:Postmort Moriam Lividity

سڑاند کی وجہ سے جمے ہوئے خون آبی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی خون میں خون پاشی شروع ہو جاتی ہے اور گیس کے دباؤ سے مرنے کے بعد کی حالت بھی بدل سکتی ہے۔

جلد، بالوں اور زخموں میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔ 36 سے 48 گھنٹوں میں تعفن والے چھالے جلد پر دکھائی دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جلنے کے بعد چھالے اُبھر آئے ہیں۔ ان چھالوں میں گیس کے علاوہ سرخی مائل مائع ہوتا ہے۔

ہاتھ اور پیر کی کھال 72-48 گھنٹوں میں دستانوں یا موزوں کی طرح اُدھڑ جاتے ہیں۔

کیڑے مکوڑوں (Maggots) کا ظہور:

تعفن کے سبب مکھیاں 24-12 گھنٹوں میں ہی کھنچی چلی آتی ہیں اور وہ جسم کے حصوں پر انڈے دے دیتی ہیں۔ خاص کر اگر زخم کھلا ہو اور کھلے طبعی دہانے جیسے ناک، منہ اور اعضا تناسل زنانہ و مردانہ نیز مقعد نم ہوں تو یہ عمل تیز تر ہوتا ہے۔

مکھیوں کے انڈے سے 24 گھنٹوں میں Maggots نکل آتے ہیں جو پتو کی شکل کے ہوتے ہیں اور رینگ کر جسم کے اندرونی حصے کی راہ اختیار کرتے ہیں جہاں پہنچ کر نرم نسیجوں کو تباہ کرتے ہیں۔

4 سے 5 دنوں میں ہی Maggots اب Pupae میں بدل جاتے ہیں اور مزید 4-5 گھنٹوں میں Pupae مکھیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

جو کیڑے مردہ جسم سے غذا حاصل کرتے ہیں وہ Forensic Entamology کے شعبہ میں پہچانے جاتے ہیں اور طبی قانون میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ چونکہ ان کیڑوں کی موجودگی سے موت کی مدت کا پتہ چلتا ہے۔

یہ ساری تبدیلیاں مختلف اشخاص میں مختلف مدت میں پوری ہوتی ہیں اور دفن کے طریقوں، درجۂ حرارت اور جسد خاکی کو جس ماحول میں رکھا گیا ہے اس پر منحصر کرتا ہے۔

ہندوستان میں ہڈیاں بغیر تابوت کے ایک سال کے اندر سڑ گل جاتی ہیں لیکن تابوت کے اندر دفن ہونے پر تین سے دس سال بھی لگ سکتے ہیں۔ ہڈیاں سڑ کر وزن کھو بیٹھتی ہیں اور پھر بُھر بُھری ہو جاتی ہیں اور دس سے پچیس سال میں تو خاک میں مل جاتی ہیں۔

موت کے بعد جسم میں ہونے والے تغیرات کا سائنسی مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ ایک دن ہمیں اسی خاک میں مل جانا ہے۔ لیکن ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا اللہ پر، اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، ملائکہ پر، یوم آخرت پر اور خیر و شر پر ہے جسے اللہ نے متعین کیا ہے۔ قرآن کی روشنی میں اگر اس پر غور کریں تو مرنے کے بعد جسم خاک میں مل چکا ہے اور نام و نشان باقی نہیں رہا پھر بھی روزِ قیامت حساب کے لیے اٹھایا جائے گا۔

سوال تب بھی تھا اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کا اب بھی ہے۔

وَقَالُوٓاْ أَءِذَا كُنَّا عِظَاماً وَرُفَاتاً أَءِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقاً جَدِيدا

(انھوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور (مٹی ہو کر) ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا کر کے دوبارہ اٹھا کر کھڑے کر دیے جائیں گے؟)

(بنی اسرائیل، آیت:49)

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَجْمَعَ عِظَامَهُ

(کیاانسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع کریں گے ہی نہیں۔)

(القیامہ،آیت:3)

يَقُولُونَ أَئِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ. أَئِذَا كُنَّا عِظَاماً نَّخِرَةً

(کہتے ہیں کہ کیا ہم پہلی کی سی حالت کی طرف پھر لوٹائے جائیں گے کیا اس وقت جبکہ ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔)

(النزعٰت،آیت:11-10)

ذَلِكَ جَزَآؤُهُم بِأَنَّهُمْ كَفَرُواْ بِآيَاتِنَا وَقَالُواْ أَئِذَا كُنَّا عِظَاماً وَرُفَاتاً أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقاً جَدِيداً.

(یہ سب ہماری آیتوں سے کفر کرنے اوراس کہنے کا بدلہ ہے کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزے ریزے ہو جائیں گے پھر ہم نئی پیدائش میں اٹھا کر کھڑے کیے جائیں گے۔ (بنی اسرائیل،آیت:98)

اللہ نے جواب میں فرمایا کہ جو اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے وہ ان جیسوں کی پیدائش یا دوبارہ انھیں زندگی دینے پر بھی قادر ہے کیونکہ یہ تو آسمان و زمین کی تخلیق سے زیادہ آسان ہے۔

لَخلقُ السمٰوٰتِ و الارضِ اکبرُ مِنْ خَلْقِ النّاسِ وَلکن اکثرَ النّاس لَا یَعلَمُوْنَ

(آسمان وزمین کی پیدائش یقیناً انسان کی پیدائش سے بہت بڑا کام ہے، لیکن (یہ اور بات ہے کہ) اکثر لوگ بے علم ہیں۔

(المومن،آیت:57)

ooo

مردہ جسم کوٹھکانے لگانے کے طریقے

(DISPOSAL OF DEAD BODY)

آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان جھگڑا ہوا اور نتیجے میں ہابیل کا قتل ہوگیا۔ انسان کا پہلا خون تھا اور اس ناحق خون کا بوجھ آدم کے بیٹے قابیل پر پڑا کیونکہ بنی نوع انسان کا وہ پہلا شخص تھا جس نے قتل جیسے فعل کا ارتکاب کیا۔

مجھے فساد کی جڑ، قتل کے اسباب اور اس قتل ناحق کی سزا اور اس سے متعلق روایات اور حکایات میں نہیں جانا ہے بلکہ اس بے جان جسم کا کیا حشر ہوا اس پر توجہ ہے۔

آج کل بھی ناحق قتل کے بعد قاتل نعش کوٹھکانے لگانے کے کیسے کیسے جتن کرتا ہے جو اخباروں میں پڑھنے اور ٹیلی ویژن پر دیکھنے کو ملتے ہیں

بھائی کا قتل ہوگیا اور قابیل نادم و پشیمان تھا کہ اب کیا کرے جس کا ذکر سورۃ المائدہ کی آیت 31 میں آیا ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَاباً يَبْحَثُ فِيْ الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ
أَخِيْهِ قَالَ يَا وَيْلَتَا أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ
فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ أَخِيْ فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِيْنَ.

(ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کھود رہا تھا تا کہ اسے دکھائے کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کی نعش کو چھپا دے، وہ کہنے لگا، ہائے افسوس! کیا میں ایسا کرنے سے بھی گیا گزرا ہو گیا کہ اس کوے کی طرح اپنے بھائی کی لاش کو دفنا دیتا؟ پھر تو بڑا ہی پشیمان اور شرمندہ ہو گیا۔)

یقیناً جسم بے جان کو ٹھکانے لگانے (Disposal) کی نشاندہی اس کوے کے ذریعہ ہی ہوئی اور شاید تب سے ہی یہ سلسلہ چل پڑا کہ جسد خاکی کو زمین کے نیچے دفن کیا جانے لگا۔

آج میں بے جان جسم کو ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں گفتگو کروں گا۔ چونکہ اس کا تعلق نہ صرف عقائد، مسلک، مذہب اور مختلف تہذیبوں سے جڑا ہے جو ابتدائے آفرینش سے شروع ہوا ہے شاید روزِ محشر تک رہے گا۔

قرآن کے حوالہ سے میں اس بات کو یقین کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ مردہ کو دفن کرنے کی ابتدا پہلی موت سے ہوئی اور مختلف ادوار میں مختلف تہذیبوں اور تمدن میں تغیر و تبدیلی آتی گئی مگر اہل ایمان کے یہاں وہی روایت قائم ہے یعنی 'خاک تا خاک۔''

دفن کرنے میں بھی جدت ہوتی رہی یعنی پتھر کا تابوت (Sarcophagus)، تہہ خانہ (Crypts)، تربت، مرقد (Sepulchre)، مقبرہ (Mausoleum) یا پھر اہرام (Pyramid) وغیرہ لیکن دفن کرنا سب سے احسن طریقہ مانا جاتا رہا۔

دفن کرنے کے علاوہ دوسرا طریقہ سپردِ خاک کے بجائے نذرِ آتش (Cremation) ہے جو آج بھی ہندوؤں کے یہاں واحد طریقہ ہے۔ زرتشتوں یا آتش پرستوں کے یہاں بلندی پر کھلے آسمان کے نیچے یعنی Sky Burial کا رواج ہے تا کہ جنگلی پرندے یعنی چیل، گدھ آ کر اس کا صفایا کر جائیں۔ تبت میں بھی یہی رواج ہے۔ چونکہ ان کے مذہبی عقائد یہ ہیں کہ پرندے روح کو بہشت میں پہنچائیں گے مگر تبت میں زمین کھودنا ایک امرِ محال ہے اور درختوں کی بھی کمی ہے کہ مردے کو جلایا جا سکے۔ بودھ مذہب کا عقیدہ ہے کہ موت کے بعد روح کے پرواز ہونے سے جسم ایک خول رہ جاتا ہے لہٰذا جانوروں کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

بعض تہذیبوں میں جسم کے سڑنے اور گلنے کے عمل کو روکنے کی بھی تدبیر ہوئی ہے۔ جیسے دوا لگا کر ممی بنانا(Mummification) یا حنوط(Embalming) کرنا۔ بعض تہذیبوں میں جو ماہی گیری یا بحری ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں وہاں پانی کے اندر(Burial at Sea) دفن کرنے کا رواج ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں زندگی بسر کرنے والے درختوں سے لٹکانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

غرض مختلف تہذیب میں مختلف دور میں جسم کو ٹھکانے لگانے کا مختلف طریقہ رہا ہے۔ آج کا دور سائنس کے ترقی کا دور ہے لہٰذا آج کی فکر قدرے سائنسی ہے۔

ایک نیا طریقہ دفن ماحولیاتی ایجاد ہوا ہے جسے Ecological Burial کہتے ہیں جس میں مردہ جسم کو یخ بستہ بنا کر محفوظ کیا جاتا ہے پھر پورے جسم میں ارتعاش(Vibration) کی مدد سے سفوف یعنی Pulverise کر دیا جاتا ہے۔ پھر خشک برادے کو نقطۂ انجماد(Freezing Point) سے گزار کر ان سے معدنیات کو نکال کر دفن کر دیا جاتا ہے جو اس عمل میں پورے جسم کے وزن کا 30% ہی سفوف کی شکل میں بچ جاتا ہے اور دفن ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک طریقہ Cryonics کا ہے جس میں جسم کو سڑنے گلنے سے بچانے کے لیے محلول نائٹروجن کی مدد سے Cryopreservation کیا جاتا ہے۔ جو لوگ Cryonics کو قبول کر چکے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل میں ٹکنالوجی اس قدر وسعت پائے گی کہ قانونی طور پر مُردوں کو زندہ کیا جا سکے گا اور پھر سے جوانی آ سکے گی۔ 2007 تک تقریباً ایسے 150 لوگ دنیا کی دو تنظیموں کے اثر سے Cryopreservation قبول کر چکے ہیں جن میں پہلی Alcor Life Extension Foundation اور دوسری Cryonic Institute ہے۔

یہی نہیں اب تو خلائی مدفن (Space Burial) بھی رائج ہو چکا ہے جس میں سوختہ باقیات کو راکٹ کے ذریعہ مدار(Orbit) میں پہنچایا جاتا ہے اور یہ بھی 150 مرتبہ عمل میں آ چکا ہے۔

بعض اپنے سارے جسم کو عطیہ کر دیتے ہیں یا وصیت کر جاتے ہیں کہ موت کے بعد طبی تعلیم میں جسدِ خاکی کو استعمال کیا جا سکے۔ امریکہ میں تو Uniform Anatomical Gift Act

بھی بن گیا ہے جو اپنے اعضا کا عطیہ کرنے کے بعد بقیہ حصوں کو بجائے نذر آتش کرنے کے میڈیکل کالج میں بھیج دینے کی وصیت کرتے ہیں تاکہ اخراجات تجہیز و تکفین سے بھی بچ جائیں۔

غرض یہ وہ مختلف صورتیں ہیں جو بے جان جسم کو ٹھکانے لگانے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں۔اب ان صورتوں کی تفصیل میں جائیں تو سب سے پہلے تدفین کا نمبر آتا ہے۔

تدفین(Burial):

تجہیز و تکفین کی رسومات جو عام ہیں اُس میں جسم انسانی کو زمین کے اندر دفن کر دیا جاتا ہے۔اس عمل میں زمین کے اندر خندق یا گڑھا کھود کر مٹی باہر نکال لی جاتی ہے۔مردہ کو قبر میں لٹا کر اس کی قبر کو لکڑی یا پتھر سے پاٹ دیا جاتا ہے اور نکلی ہوئی مٹی سے ڈھک دیا جاتا ہے۔فاضل مٹی قبر کی ابھری شکل اختیار کر لیتی ہے۔

مسلمانوں اور مسیحیوں دونوں کے یہاں دفن کیا جاتا ہے مگر مسیحیوں کے یہاں تابوت کے اندر دفن کیا جاتا ہے جبکہ مسلمانوں کے یہاں صرف کفن میں لپیٹ کر ہی دفن کر دیا جاتا ہے۔

اسبابِ تدفین:

انسانی جسم کی تدفین دراصل مردہ کو احترام کے ساتھ سپرد خاک کرنا ہے۔چونکہ دفن کے بعد ہی زندگی بعد الموت کا تصور شروع ہوتا ہے۔مختلف مذاہب اور تہذیبوں اور ثقافتوں میں جسم کو اسی حالت میں دفن کرنا اہم مانا جاتا ہے۔

جسم کو زمین، پہاڑوں اور چٹانوں پر جنگلی جانوروں کے لیے چھوڑ دینا نہایت بے حرمتی ظاہر کرتا ہے۔

دفن کرنے اور اس عمل میں اعزا و اقارب کا شامل ہونا مرنے والے سے قربت اور محبت ظاہر کرتا ہے اور موت کا صدمہ لواحقین کے لیے کم ہو جاتا ہے۔

موت کے بعد جسم کا سڑنا، گلنا اور تعفن تکلیف دہ امر ہے۔

عام طور پر عزت کے ساتھ تدفین اور پھر کندہ کردہ کتبہ سرہانے لگانا عام ہے جن میں بعض تو بڑے رسم و رسوم کے پابند ہیں۔

طریقہ تدفین:

اکثریت قبر میں ہی دفن کی جاتی ہے جو مخصوص علاقے میں انگنت قبروں کے درمیان یعنی قبرستان میں عمل میں آتی ہے۔

گورکن قبر کی کھدائی میں ماہر ہوتے ہیں اور ایک مستطیل حصے کو کھود کر مٹی ہٹا لیتے ہیں اور اس مستطیل حصے کے درمیان میں ایک قبر یا شگاف کھود دیتے ہیں تا کہ مردہ کو لٹا کر اسے پاٹا جا سکے اور پھر مٹی بھر دی جاتی ہے۔ مردہ کے لیٹنے کی جگہ سے نکالی مٹی زائد ہوتی ہے اس لیے قبر ہموار زمین پر ابھر آتی ہے۔

وصیت:

مسلمانوں اور مسیحی دونوں مذاہب میں وصیت کو بڑا دخل ہے۔ زمین و جائیداد کے حصے اور بٹوارے کے لیے تو وصیت ہوتی ہی ہے بعض لوگ اپنے مردہ جسم کے لیے بھی وصیت کر جاتے ہیں کہ فلاں جگہ دفن کیا جائے، فلاں غسل دے اور فلاں عالم نماز جنازہ پڑھائے۔

مسلمانوں میں شاذ و نادر ہی ایسی وصیت ہوتی ہے جو مسیحیوں میں عام ہے یعنی اس کی ذاتی اشیا جیسے پسندیدہ زیور، لباس، تصاویر بھی ساتھ دفن کر دی جائیں۔

قبر میں جسم کو رکھنے کا طریقہ:

مسلمانوں کے یہاں مردے کو بڑے احترام سے اٹھا کر آہستگی سے قبر میں رکھتے ہیں اور ہندوستان میں داہنی طرف پہلو بدل دیتے ہیں تا کہ چہرہ اور جسم قبلہ رخ ہو جائے۔

مسیحی رواج یہ ہے کہ جسم کو قبر میں سیدھا لٹا دیا جاتا ہے۔ ہاتھ پیر سب سیدھے ہوتے ہیں یا بازو کو سینے پر رکھ دیتے ہیں۔ آنکھیں اور منہ بند کر دیے جاتے ہیں کچھ لوگ بجائے چت کے پٹ بھی لٹاتے ہیں۔

مسیحی پورب پچھم رخ لٹاتے ہیں جس میں سر پچھم کی طرف چونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا ورود اسی طرف سے ہوگا۔

بعضوں میں جسم کو بالکل موڑ دیتے ہیں تا کہ گھٹنا پیٹ سے سٹ جائے۔ پرانے زمانے میں جنگجو سپاہیوں کو بالکل سیدھا کھڑا دفن کیا جاتا تھا۔

مقامِ تدفین:

تدفین کی جگہ عام طور پر خواہ وہ مسیحی ہوں یا مسلمان آبادی سے دور قبرستان میں ہوتی ہے۔ حفظانِ صحت کے علاوہ اکثر لوگوں میں یہ وہم قائم رہتا ہے کہ آبادی کے نزدیک ارواح کا مسکن غیر مناسب ہے لیکن بعض تہذیبوں میں لوگ اپنی قبر پائیں باغ یا رہائش کے نزدیک ہی رکھنا چاہتے تھے۔

زمانہ قدیم میں لوگ قبر چرچ کے جوار میں پسند کرتے تھے اور یہ رواج عام تھا مگر بعد میں نامور ہستیوں تک محدود کر دیا گیا۔

نشانِ تدفین:

جدید رواج یہ ہے کہ قبر کے سرہانے کتبہ آویزاں کیا جائے جس کے دو فائدے ہیں، ایک تو یہ کہ غلطی سے لاش کھود کر نکالی (Exhumation) نہ جائے اور دوسرے مردہ کی معلومات کندہ کی جائیں اور اسے یادر کھا جائے تا کہ وہ پائندہ رہے اور آنے والی نسل کو شجرہ بندی میں مدد مل سکے۔

حنوط کرنا:

اسے Embalming کہتے ہیں جس میں مردہ کے جسم کو سڑنے گلنے سے بچانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور یہ طریقہ مختلف تہذیبوں میں مروج رہا ہے۔

مومیائی حالت میں رکھنے کا رواج تو ہزاروں سال پرانا ہے۔ مردہ کے جسم کو کفن میں لپیٹ کو ایک تابوت میں رکھا جاتا ہے جو کبھی جہاز نما بھی ہوتا تھا اور زمین کے نیچے محفوظ کر دیا جاتا تھا تا کہ اگر سیلاب آئے تو یہ جہاز پانی کے اوپر تیرنے لگے۔ دراصل یہ تدبیر اس لیے کی جاتی تھی کہ مردہ بیکٹر یا سے بچ جائے اور نتیجتاً سڑنے گلنے سے محفوظ رہ سکے۔ لیکن بعض ادیان میں جیسے قدیم یہودیوں میں حنوط کی اجازت نہیں اور جسم انسانی کو تابوت میں رکھ کر زمین میں جلد سے جلد دفن کرنا افضل مانا گیا ہے۔ تابوت بھی لکڑی کا ہوتا اور اس میں ذرہ برابر بھی معدنیات کا استعمال نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ کیل بھی لکڑی کی ہوتی تھی۔ اسلام میں بھی جلد سے جلد تجہیز و تکفین کی جاتی ہے تا کہ تعفن دفن سے پہلے نہ ہو اور عام طور پر تابوت بھی استعمال نہیں ہوتا بلکہ مردہ کو کفن میں ہی لپیٹ کر دفن کیا جاتا ہے۔

قدرتی مدفن:

یورپ اور دوسرے مغربی ممالک میں قدرتی مدفن مروج ہے اور اسے سب سے بہتر مانا جاتا ہے۔سب سے پہلے برطانیہ میں 1990 میں عام ہوا اور اب امریکہ میں بھی رواج پا رہا ہے۔

مردہ کو Biodegradable تابوت یا کفن میں دفن کیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سرہانے ایک پودا یادگار کے طور پر لگا دیا جاتا ہے اور کتبہ بھی نسب نہیں کیا جاتا۔ چونکہ ماحولیات کو قائم اسی طرح رکھا جا سکتا ہے۔ ماحول بھی سرسبز رہے اور Wildlife بھی محفوظ رہے۔ اسی لیے قبرستان کو وہ لوگ Woodland Cemetric یا Ecocemetries یا Green Burail Ground کہتے ہیں۔

خاندانی مدفن:

بعض زن و شوہر یا خاندان کے دوسرے قریبی افراد کی وصیت ہوتی ہے کہ زمین کے ایک ٹکڑے میں خاندان کے افراد کو دفن کیا جائے۔ بعض کی تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ بالکل ہی سٹا کر دفن کیا جائے۔

کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مرنے والا قبر کی گہرائی میں سب سے پہلے دفن ہوتا ہے اور پھر دوسرے کو اس کے اوپر دفن کیا جاتا ہے۔

مجموعی مدفن:

تاریخ میں مجموعی مدفن کے مختلف واقعات پڑھنے میں آتے ہیں اور قدیم مجموعی مدفن میں جرمن نازیوں کے مارے ہوئے سوویت سپاہیوں کے قبرستان جو جرمن فوج کے قیدی ہوتے تھے وہ آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بوسنیا، عراق، افغانستان تو ابھی حال کے مجموعی مدفن کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ مجموعی مدفن کی ضرورت اس وقت آتی ہے جب بیک وقت ایک بڑے خندق میں ساری نعشوں کو دفن کیا جائے خواہ وہ ظلم و ستم کا شکار ہوں یا بلائے ناگہانی یا آفات سماوی یا وبا کے مارے ہوں۔ ایسے میں مجموعی مدفن ایک مجبوری ہوتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ تہذیبوں میں نسل کشی کے بعد نعشوں کو دفن کیا گیا ہے۔

Genetic Testing کی سہولت ایجاد ہونے کے بعد کہا جاتا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ اب کم ممکن ہے۔

ہوادار زمین دوز قبر یا کہف (Catacombs) بھی مجموعی مدفن میں شمار ہوتے ہیں۔

قبل الموت مدفن:

زندہ دفن کرنے کی روایت زمانہ قدیم سے رہی ہے خواہ وہ عربوں کی جاہلیت ہو یا پھر ظالم حاکم کی سزا ہو۔ زندہ دفن کرانے میں دم گھٹنے، پیاس اور بھوک یا پھر زہریلی گیس سے موت ہو جاتی تھی۔

آج کے دور میں بھی گاہے بگاہے زندہ دفن کرنے کی خبریں سننے کو مل جاتی ہیں۔ خواہ وہ کان کنوں کی ہو یا عمارتوں کی تعمیر کے دوران یا پھر زلزلہ کے دوران دفن ہونے کی ہوں۔

بین المذاہب اور بین التہذیب تدفین کی مختلف رسومات ہیں جو موت کے واقع ہونے کے بعد اپنائی جاتی ہیں۔ کچھ مذاہب میں خاص کر اسلام میں بڑے احترام کے ساتھ تکفین و تدفین کی رسومات ادا ہوتی ہیں۔

بعضوں میں مردے کو جلانا ہی ایک نیک عمل ہے۔ چونکہ ان کے عقیدے کے مطابق روح پاک ہو کر روانہ ہوتی ہے۔ ہندوؤں میں یہ عام رواج ہے جس میں لکڑیوں کے ڈھیر پر ندی کے کنارے رکھ کر نذر آتش کیا جاتا ہے تا آنکہ جل کر خاک نہ ہو جائے اور بجھی راکھ کو گنگا ئے مقدس میں بہا دیا جاتا ہے یا پھر مردے کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے ملک کے مختلف مقامات پر بکھیر دیا جاتا ہے۔

افریقی امریکن غلاموں کے یہاں رواج بھی مختلف ہے۔ یوں تو افریقی امریکن غلام گوروں کے لیے مردہ جسم کو دفن کے لیے تیار بھی کرتے تھے تابوت بنانا، قبر کھودنا اور کتبہ نسب کرنا جیسے اہم کام ہوتے تھے۔ لیکن جب خود یہ مرتے تو انھیں رات کے وقت ہی دفن کیا جاتا اور یہ عمل اس کے آقا کی موجودگی میں ہوتا تھا اور ان کے جنازے میں غلام ہی شامل ہوتے تھے۔

موت کے بعد غلاموں کو کپڑے میں لپیٹ دیا جاتا، دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ دیا جاتا اور ایک دھات کے بنے ٹکڑے کو ہاتھ پر رکھ دیا جاتا تا کہ اگر روح واپس آنا چاہے تو اسے روکا جائے

اور روح کو خوش کرنے کے لیے اس کی ذاتی چیزوں کو بھی مردہ کے ساتھ دفن کر دیا جاتا۔ تابوت کو میخ سے بند کر دیا جاتا۔ قبر میں غلاموں کو پورب پچھم دفن کیا جاتا اس طرح کہ پیر پورب کی طرف ہو اور سر پچھم کی طرف تا کہ صور کی آواز سنتے ہی جو پورب سے پھونکا جائے گا اٹھ کھڑا ہو۔ پورب پچھم لٹانے کی وجہ یہ بھی کہی جاتی ہے کہ غلاموں کا اصل ملک افریقہ پورب کی طرف ہے۔

بہائی طرز:

بہائی عقیدے کے مطابق قبرستان ایک گھنٹہ کی مسافت سے کم ہونا چاہیے۔ موت ہوتے ہی جسم کو ریشمی یا سوتی کفن میں لپیٹ دیا جاتا ہے اور ایک انگوٹھی انگلی میں ڈال دی جاتی ہے جس پر یہ کندہ ہوتا ہے ''خدا کے یہاں سے آئے اور انھیں کی طرف واپس ہونا ہے''۔

تابوت پتھر یا کرسٹل کا ہوتا ہے یا پھر بہت نفیس لکڑی کا مخصوص دعائیں اور انگشتری پندرہ سال عمر سے زائد کے لیے لازمی شے ہے۔

عیسائی رواج:

عیسائیوں کے یہاں چرچ روحانی تعاون مہیا کرتا ہے۔ نہ صرف مردہ بلکہ ان کے لواحقین کا بھی خیال رکھتا ہے۔ عام طور پر دو تین دن تک مردہ جسم کو لواحقین، اعزا اقارب، دوست واحباب کی زیارت کے لیے گھر، چرچ، کلیسا یا مردہ خانہ میں رکھا جاتا ہے اور نعش کو خوش اسلوبی سے سجایا جاتا ہے اور زیارت کے آخری گھنٹے میں قبرستان لے جایا جاتا ہے جہاں رسم عبادت اور آنجہانی کے بارے میں کلمات پڑھے جاتے ہیں۔ تابوت کو قبر کے اندر رکھا جاتا ہے۔ کتبہ یا کوئی نشانی قبر کے سرہانے بنایا جاتا ہے تا کہ نشاندہی قائم رہے۔

یہودی رواج:

یہودیوں کے یہاں کبھی مردہ کو دفن ہونے تک اکیلے نہیں چھوڑا جاتا ہے۔ مردہ کو دفن ہونے تک کوئی نہ کوئی نگہ داری کرتا ہے جسے Shomerin کہتے ہیں۔ یہ لوگ کھانے پینے نیز کسی کو حکم دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو مردے کو تکلیف دینے کے مترادف ہوگا۔

یہودیوں کے یہاں کھلے تابوت میں زیارت کے لیے رکھنا بھی ممنوع ہے اور دفن کے علاوہ کسی قسم کا Cremation بھی ممکن نہیں۔

یوں تو ان کے یہاں تدفین کے لیے تابوت نہیں ہوتا لیکن اگر ہو بھی تو اس میں بہتیرے سوراخ کر دیے جاتے ہیں۔قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر دعائیں پڑھی جاتی ہیں جسے Kaddish کہتے ہیں۔ایک سال بعد نشان نسب کیا جاتا ہے۔

کورین طریقہ:

کوریا کے رہنے والے مُردوں کا بے انتہا خیال رکھتے ہیں۔مردہ مرد ہے تو مرنے کے بعد کوئی عورت اسے دیکھ نہیں سکتی اور اگر عورت ہے تو مرد نہیں دیکھ سکتا۔

زیارت تین دنوں سے نو دنوں تک جاری رہتی ہے جس میں زائرین کے لیے ناشتہ، کھانا کا ابھی انتظام ہوتا ہے۔زیارت کے درمیان کفن میں مردہ کو خاصا سنوارا جاتا ہے۔ناخن اور بال تراشے جاتے ہیں اور اس ناخن اور بال کو مردہ کے ساتھ دفن کر دیا جاتا ہے۔

نوئیر رواج:

مشرقی افریقہ کے رہنے والوں کے یہاں جتنا جلد ممکن ہو دفن کر دیا جاتا ہے۔صرف افراد خانہ ہی مردہ کو دفنانے میں شامل ہو سکتے ہیں اور اہل خانہ میں جو مذہبی ہوتا ہے وہ قربانی دیتا ہے تا کہ روح زندہ لوگوں کو پریشان نہ کرے۔

مردوں کے لیے عزاداری 5 سے 6 روز اور عورتوں یا بچوں کے لیے 2 سے 3 دن ہوتی ہے۔

یہ چند مثالیں اور چند رسومات سپرد خاک یا زیرِ زمین دفن کرنے کی تھیں لیکن ایسا نہیں کہ سبھی ادیان یا سبھی تہذیبوں میں دفن ہی کرنے کا رواج ہو بلکہ دوسرا طریقہ نذر آتش کا بھی ہے لیکن نذر آتش یا Cremation سے مختلف بعض تہذیبوں میں آدم خوری Cannibalism بھی مروج ہے جس میں بجائے تدفین مردہ جسم کو انسان ہی کھا جاتے ہیں اور یہ تصور کرتے ہیں کہ پرواز ہوئی روح کو تقویت ملے گی۔

Yanomani پہلے تو مردہ کو جلا دیتے ہیں اور پھر بچی ہوئی راکھ کو کیلے کے ساتھ خمیرہ (Paste) بنا کر کھاتے ہیں۔

نعش سوزی دفن کا بدل ہے جس میں جسم کو جلا کر خاک کر دیا جاتا ہے۔ اکثر سارا جسم جل جاتا ہے اور ہڈیوں کے ٹکڑے بچ جاتے ہیں جنھیں ذرات یا پاؤڈر میں تبدیل کر کے یا تو زیر زمین دفن کر دیا جاتا ہے یا مختلف مقامات جیسے پہاڑوں اور دریاؤں میں بکھیر دیا جاتا ہے۔

اگر نعش سوزی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو یہ طریقہ بڑا ہی قدیم ہے جس میں مردوں کو لکڑی کے بڑے کندوں پر رکھ کر خاک ہونے تک جلا دیا جاتا تھا۔

Archelogist یا ماہر آثارات کا ماننا ہے کہ شمال مغرب بحرالکاہل کے دیہی لوگ یا پھر شمال الاسکا اور کناڈا کے جوارح میں جو تہذیبیں تھیں ان میں یہ عام ہوا کرتا تھا۔

یونانیوں میں ہزار سال قبل مسیح نعش سوزی مروج تھی۔ جنگجو سپاہی اور جنگجو ہیروز کو دفن کرنے کے بجائے نذر آتش کیا جاتا تھا۔ اہل روم کے یہاں بھی امرا کو جلایا جاتا تھا۔ ہندوستان میں تو بہر حال قدیم روایت رہی ہے جہاں نہ صرف اس کی اجازت دی گئی بلکہ قدیم روایات کی مخالفت بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے یہ رواج ختم ہو چلا تھا سوائے اس کے کہ پلیگ پھیلتا تھا تو اس مرض کے شکار کو جلا کر خاک کر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ طریقہ انیسویں صدی کے اواخر میں پھر سے شروع ہوا۔ برطانیہ میں تو ملکہ وکٹوریہ کے شاہی جراح سر ہنری تھامپسن نے 1878 میں بنیاد ڈالی اور یہ طریقہ جرمنی اور نارتھ امریکہ میں 1876 میں شروع ہو گیا۔

بعض پراٹسٹنٹ مسیحیوں نے اجازت بھی دے ڈالی اور 1963 میں پوپ پال ششم نے آتش سوزی پر سے پابندی بھی ہٹالی اور 1966 میں مذہبی اجازت بھی دے دی۔

جدید طریقہ نئے ایجادات کے ساتھ سہل بھی ہو گیا ہے اور لاشوں کو شعلے والی آگ میں جلانے کے بجائے بے انتہا اونچے درجۂ حرارت $780\text{-}980^{o}$ والی بھٹی میں ڈال کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔

جدید بھٹی میں قدرتی گیسوں کے علاوہ پروپین (Propane) استعمال ہوتا ہے جبکہ 1960 تک کوئلے استعمال ہوتے تھے۔ جدید بھٹیاں کمپیوٹر کے ذریعہ قابو میں رہتی ہیں اور قانونی طور پر بے خطر ہوتی ہیں۔

خاکستر اور باقیات دوسری جگہ منتقل کر دیے جاتے ہیں اور یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ اب کوئی ٹکڑا بچا نہیں ہے اگر بڑے ٹکڑے بچے ہیں تو Incineration کے لیے مشین میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں Cremulator سے ریزے میں Grind ہو کر بدل جاتا ہے۔

آگ میں ڈالنے سے پہلے زیورات، انگشتری، گھڑی اتار لی جاتی ہے اور صرف وہ چیزیں چھوڑ دی جاتی ہیں جو غیر طبعی نہ ہو جیسے Pacemaker چونکہ یہ بھٹی میں پھٹ سکتی ہے۔

باقیات کو اہل خانہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور دفن کرنے کے لیے ایک سرٹیفکٹ بھی دی جاتی ہے۔

جلے ہوئے راکھ کو منقش خاک دان میں رکھا جا سکتا ہے، خطۂ ارض پر چھڑکا جا سکتا ہے۔ پہاڑوں، سمندر یا زمین میں دفن کیا جا سکتا ہے۔

آج کے دور میں ہیلیم غباروں، راکٹوں اور ہوائی جہاز سے چھڑکاؤ بھی کیا جا سکتا ہے بعض تو خلا میں بھی بھیج دیتے ہیں۔ بعض لوگ مصنوعی ہیرا بھی بنوا لیتے ہیں۔ بعض مردے کی اچھی پینٹنگ بھی بنوا لیتے ہیں۔ گویا ان حرکات سے وہ امر رہے گا ایسا خیال کیا جاتا ہے۔

OOO

موت کے بعد (اسلامی نقطۂ نظر سے)

(AFTER DEATH: ISLAMIC POINT OF VIEW)

سائنسی اصول کے مطابق انسانی خلیے میں خستہ حالی (Degeneration) اور احی (Regeneration) کا سلسلہ چلتا رہتا ہے اور بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ تحولی نظ (Metabilic Activity) میں کمزوری پیدا ہونے لگتی ہے اور جہاں خستہ حالی کی بالادستی ق ہوئی وہی موت کا باعث بن جاتی ہے۔

موت کا سبب خواہ کچھ بھی ہو جو ممکن ہے ظاہر ہو جائے مگر کبھی کبھی تو سبب مخفی ہوتا اور بڑے سے بڑے طبیب اور معالج کی سمجھ سے باہر ہوتا ہے۔

عالمی انجمن صحت (WHO) کے مطابق موت کے پندرہ بڑے اسباب ساری میں اس طرح ہیں۔

1۔ دل کی عروقی بیماریوں سے	12.6%
2۔ قلبی بیماریوں سے	9.7%
3۔ صدر یا تنفس کی بیماریوں سے	6.8%
4۔ ایچ آئی وی یا ایڈز سے	4.9%

5۔	دمہ اور پھیپھڑوں کی بیماریوں سے	4.8%
6۔	دست و قے سے	3.2%
7۔	تپ دق یا ٹی۔بی سے	2.7%
8۔	ملیریا سے	2.2%
9۔	سانس کی نلی اور پھیپھڑوں کے سرطان سے	2.2%
10۔	سڑکوں پر حادثات سے	2.1%
11۔	بیماری اطفال سے	2.0%
12۔	دیگر حادثات سے	1.6%
13۔	بلڈ پریشر سے متعلق بیماریوں سے	1.6%
14۔	خودکشی سے	1.5%
15۔	معدہ کے سرطان سے	1.5%

یہ وہ بیماریاں ہیں جسے سائنس پہچانتا ہے اور تشخیص کرتا ہے لیکن طبیعی موت اور اچانک موت کے اسباب یا حادثات سے دوچار ہونے کے بعد موت پر سائنس اپنی رائے پیش کرنے سے معذور ہے۔

عام طور پر موت کی تعریف اعضا رئیسہ کے عمل کے رُک جانے سے اور غیر قابل تنسیخ ہونے سے کی جاتی ہے۔

زمانہ قدیم میں موت کے اسباب کی تلاش اور چھان بین غیر ضروری تھی۔ نہ ہی کوئی قانونی پیچیدگیاں تھیں نہ کوئی قانونی اہمیت۔ سانس کے رُکنے کے عمل کو موت کہا جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ دوران خون کے رکنے اور حرکت قلبی کے رک جانے یا نبض سے موت کی شناخت ہونے لگی۔ پھر طویل بیہوشی بھی دماغ کی کارکردگی کے رک جانے کا سبب مانا جانے لگا۔ سائنسی ایجادات، انکشافات اور پھر دنیائے طب میں Intensive Carc کے شعبہ کے کھل جانے سے حیات و موت کا فاصلہ بڑھ گیا اور Brain Death کی شناخت ہوئی۔ پیچیدگیاں اور بڑھیں چونکہ برین ڈتھ کے باوجود مصنوعی تنفس (Artificial Respiration) پر لوگ رکھے جانے لگے اور اس طرح پیوندکاری (Organ Transplant) کو بھی ترقی ملی۔ چونکہ اعضا کی خستہ حالی

(Degeneration) سے قبل اعضا کی منتقلی لازم ہوتی ہے اور اس طرح موت کی تعریف 1986 کے بعد پھر بدل گئی۔ برین ڈتھ کے بعد اخلاقی و قانونی مسائل بھی کھڑے ہونے لگے۔ چونکہ برین ڈتھ کے بعد بھی کئی اعضا زندہ رہتے ہیں اور ایسے میں پیوندکاری کا فیصلہ بڑا اہم ہوتا ہے۔ برین ڈتھ خود نا قابل تنسیخ ہے اور ایک بار دماغی موت ہوگئی تو اس میں جان لانا ناممکن ہے۔ ممکن ہے آنے والے دنوں میں کچھ دوسرے رموز افشاں ہوں اور گتھیاں سلجھیں۔

سائنس اپنے دائرہ میں تجربات وتحقیقات کی بنا پر یہ تو کہہ سکتا ہے کہ موت وحیات کے قریب کو چند وسائل سے متاثر کرسکتا ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتا اور نہ کرسکتا ہے کہ موت کے حکم کو ٹال دے یا ملتوی کردے۔ پھر سائنس کے پاس اس کا بھی جواب نہیں کہ موت کیوں اٹل ہے اور موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے۔

سائنسی تجربات، سائنسی تحقیقات، تجربہ گاہوں کے گلیاروں سے نکل کر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ ''جو تھا وہ نہ رہا'' --- کہانی ختم!!

انسان زندہ تھا، سوچنے والا دماغ، دھڑکنے والا دل اور سانس لینے کا فعل رکھتا تھا۔ یہ سارے افعال ترک ہوگئے اور انسان فنا ہوگیا۔

مگر---- ہمارے پاس سوچنے والا دل، سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں ہیں بات ختم نہیں ہوئی بلکہ کہانی کا کلائمکس تو اب شروع ہوتا ہے جس پر ہم کبھی غور نہیں کرتے کہ کیا زندگی بس اس مختصر سے وقفے کا نام ہے؟ کیا سب ایک لگے بندھے قانون کے مطابق ہورہا ہے جسے ایک بے ارادہ فطرت چلا رہی ہے؟ بلکہ اگر سنجیدگی سے غور کریں، تدبر وفکر کی راہ اختیار کریں تو ہرگز ہمارا دل اسے قبول نہ کرے گا۔ یہ سب ایک اتفاقی عمل ہے اور ہمیں یقیناً زندہ ہونا ہے۔

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاء اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ. ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ."

(لوگو! اگر تمھیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوئی اور بے شکل بھی۔ ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینہہ برسائے کہ یکایک وہ بھیگ اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اور ہر چیز پر قادر ہے اور قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں۔) (سورۃ الحج، آیت: 5 تا 7)

قرآنی آیات، علمادین کے بیان اور بزرگوں سے ایمان و یقین، زندگی و آخرت پر ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ لیکن کبھی اس پر غور و خوض نہیں کرتے۔

حد تو یہ ہے کہ یہ سوال نہ صرف دینی محفلوں میں اٹھائے گئے بلکہ راہ چلتے گلی کوچوں یا آرام سے بیٹھے آرام دہ ڈرائنگ روم میں بھی سنے۔

''کاہے کو دنیا بنائی تو نے۔ دنیا بنانے والے''

ہمیں اتنی فرصت بھی نہیں کہ فلمی گانوں پر بھی غور کرلیں بلکہ موسیقار کی موسیقی اور گلوکار کی گلوکاری اور شاعر کی شاعری کی داد دیتے چلے گئے اور آواز و آہنگ کی دنیا میں کھو گئے۔ پھر یہ آوازیں بھی گونجیں اور اس پر دھیان نہ گیا

''جانے چلے جاتے ہیں کہاں۔ دنیا سے جانے والے''

کبھی ہم نے گانے کے ان بولوں پر بھی توجہ نہ دی اور اپنی دنیا کے میلے میں ایسے گم ہوئے کہ زندگی و آخرت کی حقیقت پر بھی غور نہ کر پائے۔

عقلی طور پر ہم سب جانتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن ہمیں مرنا ہے لیکن عام طور پر اس کے لیے غیر آمادہ ہیں اور اس سے متعلق جانکاری ہمارے دل ہی کو نہیں چھوتی اور ہم اپنی زندگی ایسے بسر کرتے ہیں جیسے ساری زندگی ہمیں یہیں گزارنا ہے۔ ہماری ساری کاوشیں، تگ و دو اپنے آرام و آسائش، جاہ و ثروت، ہردلعزیزی اور لذت دنیاوی کے لیے وقف ہو جاتی ہیں۔ ہمارا سارا وقت ہماری ساری توانائی اسے حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اور اکثر ہم بھلے برے کے فرق کی بھی تمیز نہیں رکھتے اور نہ جانے کتنے حدود کو تجاوز کر جاتے ہیں۔

قرآن مجید ایسے تصورات کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"وَقَالُوٓاْ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِيْنَ."

(آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔)

(سورۃ الانعام، آیت:29)

پھر دوسری جگہ:

"وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ."

(یہ لوگ کہتے ہیں کہ ''زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔)

(سورۃ الجاثیہ، آیت:24)

اوران کی کم علمی اور کم عقلی پر اللہ فرماتا ہے:

"يَعْلَمُونَ ظَاهِراً مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ."

(لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں۔) (سورۃ الروم، آیت:7)

ہم ذرا آنکھیں بند کر کے اس وسیع و عریض کائنات کی عظمت اور وسعت کا تصور کریں پھر سوچیں کہ اس کائنات کا مرکز وجود انسانی ہے۔ کیا اس کی حقیقت بس یہی ہے کہ بچپن کے اور بڑھاپے کے مابین ایک تھوڑے سے وقفہ کے ہوش و شعور کا نام حیات انسانی ہے۔ خالق فرماتا ہے:

"وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ"

(وہ دل رکھتے ہیں لیکن غور نہیں کرتے، آنکھیں رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں مگر سنتے نہیں، وہ حیوانوں کے مانند ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ گئے گزرے۔) (سورۃ الاعراف، آیت:179)

پھر فرماتا ہے:

"بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا. وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى"

(تم حیات دنیوی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔) (سورۃ الاعلیٰ، آیت:16 تا 17)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخرت کیا ہے؟ آخرت دراصل ایمان کا جزو ہے۔ ایک مسلمان کا عقیدہ ہے کہ ایک دن اللہ تبارک وتعالیٰ تمام دنیا کو اور اس کی مخلوق کو مٹا دے گا اور وہ روز قیامت ہے۔ پھر سب کو ایک دوسری زندگی بخشی جائے گی اور سب اللہ کے سامنے حاضر کیے

جائیں گے اور یہ روزِ محشر ہوگا۔ تمام لوگوں کے نامۂ اعمال خدا کے حضور پیش کیے جائیں گے اور جس کی بھلائی برائی سے زیادہ وزنی ہوگی اس کو بخش دیا جائے گا اور جس کی برائی بھلائی سے زیادہ ہوگی تو اسے سزا ملے گی۔ جنھیں بخشش ملے گی وہ جنت میں جائیں گے اور جن کو سزا دی جائے گی وہ دوزخ میں بھیج دیے جائیں گے۔ عام طور پر آخرت کے متعلق دنیا میں تین مختلف عقیدے پائے جاتے ہیں۔

(1) انسان مرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ یہ عقیدہ ان کا ہے جن کا خدا پر یقین بچا ہی نہیں یعنی دہریہ ہیں۔

(2) کچھ ایسا گروہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کے لیے بار بار اس دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اگر اُس کے اعمال بُرے ہیں تو وہ دوسرے جنم میں کوئی جانور مثلاً کتا، بلی یا کوئی اور جانور بن کر اس دنیا میں آئے گا یا کوئی درخت بن کر پیدا ہوگا یا کسی بدتر درجہ کے انسان کی شکل اختیار کرے گا۔ اگر اچھے اعمال ہیں تو زیادہ اونچے مقام پائے گا۔ یہ خیال ہمارے ہندو بھائیوں کا بھی ہے۔

(3) ایک گروہ ایسا بھی ہے جو آخرت اور قیامت، حشر اور خدا کی عدالت، جزا و سزا پر ایمان رکھتا ہے اور یہی عقیدہ رکھنے والے مومن اور مسلم کہلاتے ہیں اور اسی عقیدے کا ذکر بار بار قرآن پاک میں آتا ہے۔

پہلا گروہ جو مرنے کو فنا ہو جانا بتاتا ہے وہ یہی دلیل دیتا ہے کہ مرنے کے بعد کس نے دیکھا ہے کہ دوبارہ زندگی ملے گی مگر ایک مسلمان کا آخرت پر یقین ہوتا ہے وہ ایمان بالغیب بھی رکھتا ہے۔ کلام الٰہی پر کامل یقین ہے لہٰذا وہ اس طرح کا عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔

دوسرا گروہ جو اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنے پر یقین رکھتا ہے اور ایمان رکھتا ہے کہ بار بار اس دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اچھے اعمال کے بدلے اچھی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور برے اعمال پر جانور یا درخت اور پیڑ پودوں کی شکل میں پیدا ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے کیا چیز تھے۔ اگر انسان تھے تو ماننا پڑے گا کہ پہلے حیوان یا درخت ہوں گے تب ہی تو اچھے عمل کے بدلے یہ شکل ملی اور اگر پہلے حیوان تھے یا درخت تھے تو ماننا پڑے گا کہ اس سے پہلے انسان تھے اور اب کسی برے

عمل کی وجہ سے یہ شکل ملی۔ غرض یہ کہ اس طرح کے عقیدے کے ماننے والے مخلوق کی ابتدا کیسے ہوئی قرار نہیں پاسکتا۔ اور یہ باتیں عقل سے بعید اور عقل کے خلاف ہیں۔

تیسرے گروہ کے ماننے والوں کو یہ معلوم ہے کہ ایک دن قیامت آئے گی اور پھر سے ایک دنیا قائم ہوگی۔ سائنس داں حضرات بھی اس بات سے متفق ہیں کہ ایک دن سورج ٹھنڈا اور بے نور ہو جائے گا، سیارے ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور دنیا تباہ ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ کہ ''انسان کو دوبارہ زندگی بخشی جائے گی''؟ یقیناً ممکن ہے کیونکہ جو زندگی جی رہا ہے اسے کیسے حاصل ہوگی۔ چونکہ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا وہ دوبارہ بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔

اس گروہ کی تیسری بات کہ ''انسان اس دنیا میں جو کرتا ہے اس کا ریکارڈ محفوظ ہے اور اسی کے مطابق سزا و جزا نصیب ہوگا۔ اس پر بھی شک نہ ہونا چاہیے کیونکہ سائنس کی دنیا میں جو غیر ممکن تھا اب سائنس کی ترقی سے ممکن ہو چکا ہے۔ جیسے ہماری آوازیں ہوا میں ارتعاش پیدا کر کے غائب ہو جاتی ہیں۔ مگر سائنس اب کہتا ہے کہ ہر آواز اپنے گرد و پیش کی چیزوں پر اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے جس کو دوبارہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ گراموفون، ٹیپ ریکارڈر، سی۔ڈی اسی اصول پر بنتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ہماری ہر حرکت ڈیجیٹل کیمرے کے مانند یو۔ٹیوب کی طرز پر منقش ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا یہ بات بالکل یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہمارا نامۂ اعمال محفوظ (Save) ہوتا جارہا ہے اور یوم قیامت Memory کے Decoding یا Password کے ساتھ کھل جائے گا۔

چوتھی بات کہ حشر کے روز ہمارے اعمال کے جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔ ہر انسان جب کوئی اچھا عمل کرتا ہے تو انعام کی توقع رکھتا ہے، اسے اس دنیا میں اکثر انعام نہیں دکھتا لیکن وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ برے کام کرنے والے خوب مزے کاٹتے ہیں۔ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ایسے حالات دیکھ کر انسان یہ چاہتا ہے کہ نیک آدمی کو نیکی کا اور برے آدمی کو برائی کا پھل ملنا چاہیے۔

پانچویں چیز جنت و دوزخ کے وجود کی اور اس کے حقیقت کی۔ اگر خداوند قدوس سورج اور چاند، مریخ اور زمین بنا سکتا ہے تو جنت اور دوزخ کیوں نہیں بنا سکتا۔ جب اس کی عدالت میں

اچھوں کو جزا اور بروں کو سزا ملتی ہے تو ان لوگوں کے لیے حسب فیصلہ مقام بھی چاہیے یعنی جزا پانے والوں کے لیے عزت، لطف و مسرت اور سزاواروں کے لیے ذلت، رنج و تکلیف کا مقام۔

اب سنجیدگی سے غور کریں تو ہماری عقل گواہی دے گی کہ انسان کے انجام کے متعلق جتنے بھی عقائد اس دنیا میں پائے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ عقل کو لگتا عقیدہ یہی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

" الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ . الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ."

(بہت بابرکت ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور جو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ جس نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے، اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔) (سورۃ الملک، آیت:2-1)

OOO

کوما

(COMA)

''کوما'' دنیائے طب کی ایک مختصر سی مگر معنی خیز اصطلاح ہے جسے ہم آئے دن سنتے ہیں اور سنتے ہی ایک عجیب ہیبت ناک احساس پیدا ہوتا ہے۔ دلچسپ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی معلومات اور علمی صلاحیت کے اعتبار سے معنی اور نتائج بھی اخذ کر لیتا ہے۔ عام آدمی کے ذہن میں موت سے قبل کی یہ حالت ہوتی ہے مگر ایک آس رہتی ہے کہ شاید ہوش آجائے۔

میرے ذہن میں بار بار سورۃ الزمر کی بیالیسویں آیت گردش کرتی رہی ہے۔ مختلف تفاسیر میں مختلف مفہوم اور استدلال مجھے مزید الجھن میں ڈال رہا ہے۔ اپنی کم علمی کا احساس بار بار ہو رہا ہے۔ سائنس کا ایک ادنیٰ طالب علم کلام الٰہی کے اشاروں کو سمجھ نہیں پا رہا ہے۔ ان آیات کا سائنسی پیمانے میں جواب ڈھونڈ رہا ہے۔ ہمارے قارئین بھی اس آیت پر غور کریں چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ خود غور کرنے کی تلقین فرما رہا ہے۔

یقیناً یہ میرا میدان نہیں پھر بھی آیت مبارکہ کے آخری جملے کی ترغیب پر نشانیاں تلاش رہا ہوں۔

''اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا

فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضَى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَى إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى إِنَّ فِيْ ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ."

(اللہ روحوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی انھیں ان کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے، پھر جن پر موت کا حکم لگ چکا ہے انھیں تو روک لیتا ہے اور دوسری (روحوں) کو ایک مقرر وقت تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ غور کرنے والوں کے لیے اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔)

(سورۃ الزمر، آیت: 42)

اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر جو علمائے کرام نے کیا ہے اس کے تحت

(1) اللہ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت --- یعنی وفات کبریٰ جس میں روح قبض کر لی جاتی ہے اور واپس نہیں آتی۔

(2) اور جن کی موت نہیں آئی ان کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے۔ یعنی جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا، تو سونے کے وقت ان کی روح بھی قبض کر کے انھیں وفات صغریٰ سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔

(3) پھر جن پر موت کا حکم لگ چکا ہے انھیں تو روک لیتا ہے --- یہ وہی وفات کبریٰ ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں روح روک لی جاتی ہے۔

(4) اور دوسری (روحوں) کو ایک مقررہ وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے --- یعنی جب تک ان کا وقت موعود نہیں آتا، اس وقت تک کے لیے ان کی روحیں واپس ہوتی رہتی ہیں، یہ وفات صغریٰ ہے۔

(5) غور کرنے والوں کے لیے اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں --- یعنی روح کا قبض اور اس کا ارسال اور توفی اور احیاء اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور قیامت والے دن وہ مُردوں کو بھی یقیناً زندہ فرمائے گا۔

تفاسیر میں نیند کو بھی وفات سے تعبیر کیا گیا ہے اور نیند کو وفات اصغر اور موت کو وفات اکبر کہا گیا ہے۔ یعنی دن کے وقت روح واپس آجاتی ہے اور انسان نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ شب و روز اور وفات اصغر سے ہم کنار ہو کر دن کو پھر اٹھ کھڑے ہونے کا معمول، انسان کی وفات اکبر تک جاری رہتا ہے یعنی Sleep Wake Cycle جاری رہے گا۔

''کوما'' کو میں نے اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے اور قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ بھی اس پر غور کریں۔ میں کلام الٰہی کی اس تلقین کے تحت کہ ''غور کرنے والوں کے لیے اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں'' کوما کی سائنس کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

لفظ ''کوما'' یونانی زبان سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ''گہری نیند'' اردو میں اسے سحابیت اور بیہوشی بھی کہا گیا ہے جس میں ہوش کا مکمل ضیاع ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اس کے اصل معنی یعنی گہری نیند پر ہی غور کریں تو یہ گہری نیند کی وہ حالت ہے جس میں حد درجہ کی بے توجہی (Unresponsiveness) ہوتی ہے اور انسان کوما کی حالت میں شدید سے شدید تحریک (Stimulation) کے باوجود ردِ عمل ظاہر نہیں کر سکتا۔

ہم جب نیند میں ہوتے ہیں تو ذرا سی آہٹ سے نیند ٹوٹ جاتی ہے اور گہری نیند ہو تو چھونے، آواز دینے اور جھنجوڑنے سے آنکھ کھل جاتی ہے لیکن کوما میں ایسا کچھ نہیں ہوتا، چونکہ طبعی ردِ عمل موجود نہیں ہوتا۔

ہوش کی ایک انتہا تو با حواس رہنا ہے اور دوسری انتہا دماغی موت یعنی Brain Death کی ہے۔ ان دونوں حالات کے درمیان کئی حالات جسے Obtundation، نیم خوابی (Drawsiness) اور مدہوشی (Stupor) کی بھی ہے۔ یہ تمام حالات کوما کے علاوہ ایسے ہیں جس میں کسی بھی محرک کا ردِ عمل حاصل ہو سکتا ہے خواہ شدت میں کمی بیشی ہو۔

اس سے پہلے کی کوما زدہ (Comatose) انسان میں تبدیلیوں پر غور کیا جائے ایک با حواس انسان کے طبعی حالت کو سمجھنا ہوگا۔

طبعی حواس کے دو خواص ہیں۔ پہلا آگہی یا واقفیت (Awareness) اور دوسری بیداری (Arousal) آگہی کی حالت میں حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل ہونے والے مراسلات پر

عمل ممکن ہے خواہ وہ نفسیاتی (Psychological) ہو یا فعلیاتی (Physiological) دونوں ہی جزو موجود ہوتے ہیں۔

نفسیاتی جز پر اس شخص کے دماغ اور ادراک کا اثر ہوتا ہے لیکن فعلیاتی جزو میں اس شخص کے دماغی عمل کا دخل نہیں ہوتا اور جو بھی ہوتا ہے جسمانی (Physical) اور کیمیائی (Chemical) حالات کے مطابق ہوتا ہے۔

آ گہی دماغ میں موجود ایک مرکز ہے جو نصف کرہ دماغ میں ایک نقطہ کی مانند ہے جو دوسرے جانوروں میں انسان کو ممتاز رکھتا ہے اور اسی کے سبب انسان میں فہم و ادراک موجود ہے۔

بیداری مکمل فعلیاتی (Physiological) عمل ہے جو کسی تحریک کے نتیجے میں دانستہ طور پر نمایاں ہوتا ہے جسے RAS (Raticular Activating System) برقرار رکھتا ہے۔ یہ کوئی دماغ کا مخصوص حصہ نہیں بلکہ مختلف حصوں جسے دماغی تنا (Brain Stem) نخاع (Medulla) عرشہ (Thalamus) اور اعصابی راستوں کا جال سا بچھا ہوتا ہے اور بیداری کا سبب بنتا ہے۔

یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ کوما میں سارے لوگ بیہوش ہوتے ہیں لیکن ہر بیہوش کوما میں نہیں ہوتا۔ نیند بیہوشی کی سی حالت ہے جس سے کسی کو جگایا جا سکتا ہے اور نباتاتی حالت (Vegetative State) بھی بیہوشی کی حالت ہے، جس میں آنکھ کھلی ہوتی ہے لیکن آ گہی اور اپنے اطراف و جوانب کی خبر نہیں رہتی۔

کوما ایسی حالت ہے کہ بیدار بھی نہیں کہا جا سکتا، نیند جیسی آنکھیں بند رہتی ہیں اور بیہوشی کامل رہتی ہے۔ ہر انسان میں Sleep Wake Cycle یعنی (بیداری۔ نیند اور بیداری) کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے مگر کوما میں یہ ممکن نہیں۔ گرچہ کوما میں انسان زندہ ہوتا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سو رہا ہے گرچہ ساری حرکات و سکنات رک جاتی ہیں۔

اسباب کوما:

اسباب تو مختلف النوع ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ سر کی چوٹ (Head Injury)، فالج (Stroke)، نشہ (Intoxication)، خرابی تحولی عمل (Abnormalities of

(Metabolism)، مرکزی عصبی نظام کی بیماریاں(C.N.S. Diseases)، اچانک عصبی صدمہ (Acute Neurogenic Injuries)، بافتوں میں آکسیجن کی کمی(Hypoxia)، دانستہ طور پر دباؤ سے پیدا کیا گیا کوما وغیرہ۔

ان سبھی حالات میں وسطی دماغ میں موجود Reticular Formation جو نیند کے نظام میں معاون ہے وہ متاثر ہوتا ہے۔ تقریباً پچاس فیصد کوما سر کی چوٹ کے سبب یا دماغ کے اندر خون کے بہاؤ میں خلل کے نتیجے میں ہوتا ہے۔

سر میں خفیف چوٹ تھوڑی دیر کے لیے انسان کو بیہوش کرسکتی ہے مگر دماغ تھوڑی دیر بعد پھر سے کام کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مرگی میں کوئی بیہوش ہوکر جلد ہی طبعی حالت میں لوٹ سکتا ہے۔ وہ لوگ جو سر کی چوٹ کے بعد ہوش میں نہیں آتے وہ یقیناً شدید چوٹ کے شکار ہوتے ہیں۔

دراصل ہماری کھوپڑی ایک مضبوط اور سخت صندوق جیسی ہے جو ہمارے دماغ کی حفاظت کے لیے بنائی گئی ہے۔ بدقسمتی سے اگر کسی وجہ سے چوٹ پہنچ جاتی ہے تو دماغ میں سوجن یا ورم شروع ہو جاتا ہے۔ چونکہ کھوپڑی اور دماغ کے درمیان آبی مادہ کی جگہ تنگ ہوجاتی ہے اس لیے دماغ پر دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔ اگر دباؤ کم نہیں کیا گیا تو پریشر بڑھتا ہی جاتا ہے یہاں تک کہ دماغی تنے پر بھی دباؤ بڑھ جاتا ہے اور تب RAS (Reticular Activating System) کو صدمہ پہنچتا ہے جو نتیجتاً بلڈ پریشر اور مرکز تنفس پر اثر انداز ہوتا ہے۔

دماغ پر چوٹ کا اثر کتنا ہے یہ شروع میں اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے چوٹ اہم بھی ہو یا نا بھی ہو۔ اگر دماغ کھوپڑی کے اندر ہل گیا ہے تو اعصابی تار جو دماغ سے جڑے ہیں انھیں نقصان پہنچا ہو، ایسے میں نارمل C.T. Scan کے باوجود کوما ہوسکتا ہے۔ سر کی چوٹ کی وجہ سے بغیر خونریزی کے بھی دماغ میں سوجن ہوسکتی ہے اور کوما ہوسکتا ہے۔

سر کی چوٹ میں دماغ کو مختلف طریقے سے چوٹ پہنچ سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ دماغی نسیج کو چوٹ پہنچے یا خونریزی ہوجائے اور کھوپڑی اور دماغ کے درمیانی حصہ میں جمع ہوجائے اسی لیے C.T.Scan لازم ہوجاتا ہے جس سے بیشتر خونریزی کی تشخیص ہوجاتی ہے۔

خونریزی (Haemorrhage)

دماغ کے اندر خونریزی خفیف بھی ہوسکتی ہے لیکن اگر ساتھ میں ورم یا سوجن ہوتو زیادہ نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

ہمارے دماغ کے اوپر متعدد جھلیاں ہیں اور ان جھلیوں کے درمیان جگہ بھی ہوتی ہے جہاں خونریزی ہوسکتی ہے۔ خونریزی عام طور پر برجافی (Epidural) یعنی ڈیورا کے باہر زیر جافیہ (Sub Dural) یعنی ڈیورامیٹر کے نیچے اور حصہ وسط دماغ (Sub Arachnoid Space) میں ہوسکتی ہے۔

برجافی اور زیر جافیہ حصوں میں خونریزی ہونے سے فوراً کوما نہیں ہوسکتا لیکن اگر چہ جاری رہا تو جس حصہ میں چوٹ ہے وہاں تو اثر ہوگا ہی دوسری طرف بھی اس کا اثر منتقل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دونوں نصف کرہ پر اثر ہونے سے بیہوشی طاری ہوجاتی ہے اور انسان کوما میں چلا جاتا ہے۔ جتنا زیادہ سوجن ہوگی اتنا شدید اور دیرپا کوما ہوگا۔

لیکن حصہ وسط دماغ جہاں مائع دماغی (Cerebro Spinal Fluid =CSF) موجود ہوتا ہے جو دماغ کو تقویت پہنچا رہا ہوتا ہے وہاں خونریزی بغیر علامت بھی ہوسکتی ہے یا بہت نمایاں اثر جیسے فالج (Stroke) بھی ہوسکتا ہے۔

خونریزی کھوپڑی یا دماغ میں بغیر چوٹ کے بھی ہوسکتی ہے۔ جیسے ہائی بلڈ پریشر یا ہائپر ٹینشن جس میں بلڈ پریشر بہت بڑھ جاتا ہے اور کنٹرول نہیں ہو پاتا۔ دماغ کی شریانیں دباؤ برداشت نہیں کر پاتی ہیں، کبھی بھی پھٹ جاتی ہیں۔

سوجن (Swelling)

یوں تو چوٹ سے دماغی سوجن ہوسکتی ہے لیکن ایک دوسری وجہ سے بھی ورم دماغ ممکن ہے۔ تنگ جگہ کے سبب دماغ پر دباؤ بھی کوما کا سبب بنتا ہے۔

آکسیجن کی کمی (Hypoxia)

دماغ کو کام کرنے کے لیے آکسیجن چاہیے اور بغیر آکسیجن کے دماغ کا کام رک جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ محض چار سے چھ منٹ اگر دماغ کو آکسیجن نہ ملے تو دماغی نسیج کی موت ہوجاتی ہے۔

جسم دماغ کو آکسیجن پھیپھڑوں کے ذریعہ پہنچاتا ہے۔ ہم سانس لیتے ہیں تو آکسیجن فضا سے ہمارے پھیپھڑوں میں آتی ہے اور خون کے لال خلیوں میں موجود ہیموگلوبین آکسیجن سے جڑ جاتے ہیں اور اس طرح رواں خون کے ساتھ آکسیجن پورے جسم میں پھیلتی رہتی ہے اور دماغ تک بھی پہنچتی ہے۔ اگر اس پورے نظام میں کوئی خلل آ جائے تو آکسیجن دماغ کو نہیں ملے گا۔

آکسیجن کی کمی کے سبب قلب کا تال (Rhythm) درہم برہم ہو جاتا ہے۔ باربط دل کی دھڑکن کم ہو جاتی ہے اور دل کے عضلات بھی خون کو پوری طرح خالی نہیں کر پاتے لہٰذا دماغ میں بھی خون نہیں پہنچ پاتا اور پل بھر میں دماغ کام کرنا بند کر دیتا ہے، پھیپھڑے بھی بیکار ہو جاتے ہیں جیسے نمونیہ، دمہ اور ایمفیز ما۔ پھیپھڑوں کے نسیجوں میں آکسیجن داخل نہیں ہو پاتی لہٰذا دوران خون میں آکسیجن کم ہو جاتی ہے۔

ہیموگلوبین خون کے سرخ خلیوں میں ایک سالمہ (Molecule) ہے جو پھیپھڑوں میں آکسیجن کو چپکا لیتا ہے اور جسم کے خلیوں تک تحویلی عمل کے لیے پہنچاتا ہے۔ انیمیا میں خون سرخ خلیوں میں کمی کے سبب دماغ کو غذا نہیں ملتی اور قلب بھی کام کرنا بند کر دیتا ہے۔

خون میں شکر کی کمی (Hypoglycaemia)

ہمارے جسم کا ہر خلیہ آکسیجن اور گلوکوز (شکر) کا محتاج ہے۔ جسم کا تحویلی عمل بغیر آکسیجن کے ممکن نہیں۔ کچھ اعضا بغیر آکسیجن کے کچھ وقفوں کے لیے زندہ رہ بھی لیں مگر دماغ تو ہرگز بغیر آکسیجن کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ دماغ بغیر گلوکوز کے کام کرنا بند کر دیتا ہے۔

عام حالات میں لبلبہ (Pancreas) انسولین بناتا ہے اور جتنی خون میں انسولین کی ضرورت ہے بنتی رہتی ہے۔ ذیابیطس کے مریض میں انسولین تب دی جاتی ہے جب اس کی مقدار کم بن رہی ہو۔ اس لیے انجکشن کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ بلڈ شوگر کی جانچ اور توازن برقرار رکھنا ضروری۔ ہوتا ہے تا کہ کمی کی وجہ سے کوما نہ ہو جائے۔

زہر (Poison)

زہر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جو انجانے میں ہم غذا یا فضا سے لیتے ہیں، دوسرے وہ زہریلے مادے جو ہمارے جسم میں بنتے ہیں مگر خارج نہیں ہوتے۔

ہمارا جسم ایک کارخانے کی مانند ہے جہاں سے غیر ضروری اشیا اور فضلات وتوانائی حاصل کرتے وقت خارج ہونا چاہیے۔ اگر یہ فضلات اور زہریلے مادے جسم سے نہ نکلیں تو جسم کے کئی اعضا ناکارہ ہوسکتے ہیں جن میں ایک دماغ بھی ہے۔

جگر کو ہی لیں جو ہمارے جسم میں مختلف کام انجام دیتا ہے جن میں گلوکوز اور لحمیات کا بننا ہے۔ تحویلی کیمیائی مادوں کو توڑنا بھی ہوتا ہے۔ جب جگر ناکارہ ہو جاتا ہے تو ہمارے جسم میں امونیا جمع ہونے لگتی ہے جس کی مقدار جسم میں بڑھ جانے سے دماغ پر اثر پڑتا ہے اور اس سے دماغ کی کارکردگی رک سکتی ہے۔

Hepatic Encephalopathy جو جگر و دماغ کا باہم مرض ہے اس کی وجہ سے Hepatic Coma ہوسکتا ہے۔

جگر میں تشمع یعنی سختی (Cirrhosis) ہوجاتی ہے یا پھر الکحل کے بے انتہا استعمال سے یہ بیماری ہوجاتی ہے۔

اسی طرح گردہ کا کام ہے زہریلے مادوں کو چھان کر پیشاب کے ساتھ بہا دینا۔ اگر گردہ کام نہ کرے تو ہمارے جسم میں بہتیرے زہریلے مادے جمع ہو جائیں گے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ دماغ پر اثر کر کے کوما پیدا کر سکتے ہیں۔ گردہ کے کام نہ کرنے سے خون میں یوریا (Urea) بڑھ جائے گا اور اس کی زیادتی اور سمومیت دماغی نسیجوں پر مہلک اثر پیدا کرے گی۔

غدہ درقیہ (Thyroid) ہمارے جسم میں Thermostat کا کام کرتا ہے۔ اگر اس میں کمی ہو جائے تو کچھ دن کے بعد Myxodema Coma ہوسکتا ہے۔

دوائیں (Drugs)

دواؤں میں بعض دوائیں جیسے Acetaminophen ضرورت سے زیادہ لینے پر جگر کام کرنا بند کر سکتا ہے اور Hepatic Coma ہوسکتا ہے۔

اسی طرح الکحل (شراب)، افیون اور ہیروئین کے بے جا استعمال سے بھی کوما ہوسکتا ہے۔

اسباب کی جانکاری کے بعد سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ کس قسم کا کوما ہے اور اس کی تشخیص کیسے ہوئی۔ چونکہ کوما ایک اضطراری حالت ہے اس لیے کوما کی تشخیص اور علاج بیک وقت شروع

کیسے ہوئی۔ چونکہ کوما ایک اضطراری حالت ہے اس لیے کوما کی تشخیص اور علاج بیک وقت شروع ہونا چاہیے۔ جب بھی بیہوشی کا مریض ایمرجنسی میں پہنچتا ہے، طبیب کا پہلا سوال ہوتا ہے کہ کیا ABC موجود ہے۔

A۔ یعنی Airway سانس کی نالیاں کھلی ہیں؟

B۔ یعنی Breathing سانس لینے کا عمل موجود ہے؟

C۔ یعنی Circulation دوران خون جاری ہے؟

جسے حرکت قلب اور بلڈ پریشر سے معلوم کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد فوراً خون میں شکر کی مقدار معلوم کر کے Hypoglycaemia کا پتہ کیا جاتا ہے۔ اگر کم ہو تو فوراً گلوکوز داخل کیا جاتا ہے۔

یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ کیا کوئی خواب آور (Narcotic) یعنی غیر معمولی طور پر گہری نیند لانے والی دوا کا استعمال تو نہیں ہوا تا کہ فوراً Naloxon رگوں کے ذریعہ اس کے اثر زائل کرنے کی غرض سے دیا جاتا ہے۔

ہر حال میں مریض کے حالات (History) اور تشخیص کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ چونکہ مریض تو قوت گویائی نہیں رکھتا لہٰذا گھر کے افراد، دوست احباب حتیٰ کہ راہگیروں سے بھی سوال کیا جاتا ہے کہ ایسا ہوا کیسے؟

مثال کے طور پر ایک شخص شراب خانے میں گر جاتا ہے، سر میں چوٹ آتی ہے اور کوما میں چلا جاتا ہے۔ ذہن فوراً جائے گا کہ اس نے زیادہ چڑھا لی ہے، گر گیا اور دماغ میں چوٹ آ گئی۔ لیکن دوسرے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کہیں ہارٹ اٹیک تو نہیں تھا، کہیں فالج کا حملہ تو نہیں تھا یا ذیابیطس سے پیدا ہونے والا مسئلہ تو نہیں جس میں اچانک خون میں شکر کم ہو گئی اور گر گیا۔

تشخیص کے لیے ایک بین الاقوامی پیمانہ تیار کیا گیا ہے جسے Glasgow Coma Scale کہتے ہیں اور اس کا مخفف ہے GCS۔ اس میں مریض کی تین چیزیں آور اس کی شدت نوٹ کی جاتی ہے۔

(1) آنکھ کا کھلنا

(3) گفتگو یا قوت گویائی

ہر کے پانچ نمبر ہیں جو کارکردگی پر منحصر کرتے ہیں۔ جتنی زیادہ مارکنگ ہوگی وہ نارمل کے قریب لے جائے گی یعنی کل مارکس 15 ہیں۔

اگر مریض کی آنکھ کھلی ہے، حکم کی تعمیل کرتا ہے اور وہ بتا سکتا ہے کہ کون ہے، کہاں ہے اور کیا ہوا ہے تو 15، اگر آنکھیں بند، حکم کی تعمیل سے قاصر اور نہ آواز نہ سوال کا جواب تو ظاہر ہے سب سے کم نمبر ہوگا۔ اگر یہ مارکس 8 یا اس سے کم ہو تو وہ شخص کوما میں ہے اور سب سے کم نمبر ۳ ہے جس میں نہ تو آنکھ کھلی ہے نہ ہی حرکت اور نہ ہی آواز یعنی وہ شخص گہرے کوما میں ہے۔

(ریسرچ سے پتہ چلتا ہے کہ 24 گھنٹے میں 87% مریض جنھیں 3 یا 4 نمبر ملا ہے تو انھیں موت ہو جاتی ہے یا پھر ذی فراش اور نباتاتی حالت (Veg. State) میں چلے جاتے ہیں اور 87% ایسے ہیں جنھیں 11 سے 15 ملا ہے وہ روبہ صحت ہوتے ہیں۔) کوما سے مماثلت رکھنے والے امراض کا بھی ذکر مناسب ہوگا۔

(1) زہریلے تحویلی امراض دماغ (Toxic Metabolic Encephalopathy):

اچانک ہونے والا یہ وہ دماغی خلل ہے جس میں اختلاط (Confusion) کے ساتھ ساتھ ہزیان یا سرسام کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اکثر بخار زہریلے پن کی وجہ سے ہو سکتا ہے لیکن حالات تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ حالت عام طور پر شدید جسمانی امراض، عفو، اعضا کے عمل کی ناکردگی اور دوسرے حالات کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

(2) قلت آکسیجن سے دماغی صدمہ (Anoxic Brain Injury):

یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دماغ میں آکسیجن کی شدید کمی ہو جائے۔ چند منٹ بھی اگر آکسیجن نہ ملے تو دماغی نسیج کی موت ہو سکتی ہے۔ سکتہ قلبی (Cardiac Arrest)، سر میں چوٹ یا کہیں اور چوٹ، غرقابی، دواؤں کا حد سے زیادہ استعمال یا سمومیت ہوتا ہے۔

(3) متواتر نباتاتی حالات (Persistant Vegitative State):

یہ ایک قسم کا شدید بیہوشی کا عالم ہوتا ہے جس میں مریض اپنے اور اپنے اطراف کے

ماحول سے بے خبر ہوتا ہے اور کسی بھی قسم کے محرک سے کوئی ردعمل نہیں ہوتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طویل مدت تک اس حالت میں رہنے کے بعد بھی بیداری کے عالم میں واپس تو آ سکتا ہے لیکن دماغ ماؤف ہو چکا ہوتا ہے۔

(4) مفصل سنڈرم(Locked-in Syndrome):

یہ نادر اعصابی حالت ہے۔ انسان کا پورا جسم مفلوج ہو جاتا ہے سوائے آنکھوں کے عضلات لیکن انسان بیدار، باہوش اور عام ذہن والا ہوتا ہے۔ وہ صرف آنکھوں کے اشارے سے بات کر سکتا ہے۔ داعیٔ اسلام احمد دیدات مرحوم نے اسی مرض میں مبتلا رہ کر کئی سال بعد وفات پائی۔

کوما میں چلے جانے پر ایسے مریضوں کا کیا ہوتا ہے؟ اور کیسے علاج ہوتا ہے؟

کوما ایک اضطراری ایمرجنسی کی حالت ہے لہٰذا اس کا علاج بھی بڑا ہی پیچیدہ اور صبر آزما ہوتا ہے۔ مریض کے اسپتال میں پہنچتے ہی اس کے ناک میں نلی ڈال دی جاتی ہے اور سانس کو قائم کرنے یا رکھنے کے لئے مشین یا Ventilator لازم ہو جاتا ہے۔ اگر دوسری خطرناک بیماریاں ہیں تو اس کا بھی تدارک ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر دماغ پر دباؤ کی وجہ سے کوما ہے تو دماغ سے پانی نکالنے کی سبیل کی جاتی ہے۔

Hyperventilation نام کی تدبیر کا استعمال ہوتا ہے جس سے سانس لینے کے عمل میں سہولت اور تیزی آتی ہے، جس سے دماغ کی شریانیں سکڑ سکیں اور دباؤ بھی کم ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ MRI اور C.T. Scan لازم ہو جاتا ہے تا کہ دماغ کے اندر رسولی یا دباؤ کے اسباب کا پتہ چل سکے۔

EEG بھی ضروری اس لیے ہوتا ہے کہ دماغ میں برقی عمل کا پتہ چل سکے۔ اگر گردن توڑ بخار ہے تو ریڑھ کی ہڈی سے پانی (C.S.F.) نکال کر جانچ کی جاتی ہے۔

جب مریض کی حالت میں استحکام آ جاتا ہے تو اس کی فکر ہوتی ہے کہ اس کے سارے اعضا بحسن وخوبی کام انجام دیں۔ کوما کے مریض اکثر نمونیہ کے شکار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر وقت علاج ہو۔

زیادہ تر مریض ICU میں رکھے جاتے ہیں تا کہ ڈاکٹر اور ان کا عملہ ہر آن نگاہ رکھے

اور باقاعدگی سے Monitor کر سکے۔ نرسیز مریض کو مستقل لیٹے رہنے سے ہونے والے زخم (Bed Sore) ہونے سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔

چونکہ مریض کوما میں ہے تو نہ وہ کھا سکتا ہے نہ پی سکتا ہے لہٰذا اس کا نعم البدل رگوں کے ذریعہ مقویات اور مائع مادے رگوں سے اس کے جسم میں پہنچائے جاتے ہیں۔

اگر مریض متواتر Ventilator پر ہے تو اکثر نرخرے یعنی Trachea میں سوراخ کر کے Tracheostomy کے ذریعہ سانس لینے میں آسانی پیدا کی جاتی ہے۔

اسی طرح چونکہ مریض کوما میں بے خبر اور بے ہوش ہوتا ہے اس لیے پیشاب پر قابو نہیں رہتا۔ لہٰذا ربر کے Catheter ڈال کر پیشاب کے عمل کو آسان بنایا جاتا ہے۔

انذار مرض یعنی پیش گوئی صحت (Prognosis):

عام طور پر کوما میں مبتلا انسان یا تو صحت یاب ہوتا ہے یا پھر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ کوما سے مریض چند روز سے لے کر چند ہفتوں میں نجات پالیتا ہے (یعنی 2 سے 5 ہفتے)۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوما میں جانے کے بعد اپنے پرانے حالات اور معمولات پر لوٹ آیا یا ایک ایسی حالت میں پہنچ گیا مگر اس کے اعضا اتنے بے کار ہو گئے کہ کسی کام کے نہ رہے اور اسی حالت میں کئی کئی سال گزر گئے اور آخر موت ہوئی۔

ایسی حالت کو نباتاتی حالت (Vegetative State) کہتے ہیں یعنی 'مردہ بہ دست زندہ' انھیں کچھ تو ہوش رہتا ہے مگر کچھ ایسے جو برسہا برس اس حالت میں پڑے ہوتے ہیں۔ اب تک زیادہ سے زیادہ 37 سال تک اس حالت میں پڑے رہنے کا ریکارڈ ہے۔

کوما اور نباتاتی حالت (Vegetative State) سے نکلنا کئی باتوں پر منحصر کرتا ہے۔ ایک تو سبب، کہاں اور کس حال میں ہوا؟ شدت؟ اور اعصاب کس قدر مجروح ہوئے؟

یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ شدید کوما میں مبتلا انسان موت کے منہ میں یقیناً چلا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایسے مریض بالکل صحت یاب ہوتے ہیں اور خفیف کوما میں مبتلا انسان شاید ہی ابھرا ہو۔

جو کوما سے ابھر آتے ہیں وہ جسمانی، ذہنی، نفسیاتی مرض کے بھی شکار ہو سکتے ہیں اور انھیں کافی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ صحت یابی کی رفتار دھیمی ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیشن گوئی بہت مشکل ہے۔ جو Vegetative State میں ہوتے ہیں وہ عام طور پر انفکشن جیسے نمونیہ کے شکار ہو جاتے ہیں اور موت واقع ہو جاتی ہے۔

ہم اطبا، سائنس داں اور ماہرین جو بھی کہہ لیں کوما میں گئے مریض کے لیے پیشن گوئی بہت مشکل ہے۔

Terry Wallis جو 19 سال سے کوما میں تھی اچانک ہوش میں آ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ اسی طرح پولینڈ کا باشندہ Jan Grzebski محکمہ ریل میں ملازم تھا۔ وہ بھی 2007 میں 19 سال کوما میں رہ کر ہوش میں آ گیا۔

دسمبر 1999 میں ایک نرس کوما میں مبتلا ایک مریض کا بستر ٹھیک کر رہی تھی کہ اچانک مریضہ اٹھ بیٹھی اور نرس کو حکم دیا کہ ''ایسا نہ کرو''۔ Pateica White Bull تقریباً 16 سال سے کوما میں تھی اور ڈاکٹر نے پیشن گوئی کی تھی کہ اب وہ کوما سے باہر نہ آ سکے گی۔ ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہوں گے، مگر ہم سائنس پر زیادہ یقین کرنے لگے ہیں۔ مگر خالق کُل کے کلام اور پیشن گوئیوں پر کم دھیان دیتے ہیں۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کوما کے مریض کو وفات اصغر میں رکھوں یا اکبر میں؟ تاہم مقولہ ہے:

''جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے''

OOO

دماغی موت

(Brain Death)

کوما کے سلسلے میں جو معلومات فراہم ہوئیں ان میں سے چند ذہن میں رکھنے کی ہیں۔

(1) 'کوما' یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''گہری نیند'' جو بیہوشی کی ایک شکل ہے اور کوما کی حالت میں مریض پر شدید سے شدید تحریک کا ردعمل نہیں ہوتا۔

(2) کوما کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔

(3) مریض اپنے اطراف اور ماحول سے بے خبر ہفتوں بلکہ مہینوں بیہوش پڑا رہتا ہے۔

(4) کوما میں مبتلا انسان صحت یاب بھی ہو سکتا ہے اور بعض عیوب کے ساتھ زندہ بھی رہ سکتا ہے۔

(5) اگر صحت یاب نہیں ہوا تو زندہ رہتے نباتاتی حالت میں چلا جا سکتا ہے۔

(6) اسی حالت میں برسوں رہتے ابدی نیند میں بھی جا سکتا ہے۔

(7) کوما کا انذار (Prognosis) بہت حد تک ناممکن ہے۔

''دماغی موت''(Brain Death) اصطلاح قدیم نہیں بلکہ محض پچاس سال پرانی ہے جس نے آج کے سائنٹفک دور میں ہیجان برپا کر دیا ہے۔ دماغی موت کی اصطلاح کسی بدشگونی کی

طرف اشارہ ہے جو اکثر ایک المیہ ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں۔ دماغی موت کی تعریف طبی ماہرین اس طرح کرتے ہیں جس میں بقول اُن کے دماغ کی تمام حرکات رک جاتی ہیں اور کبھی واپس نہیں آتی ہیں۔ یعنی بہ الفاظ دیگر دماغ اب زندہ نہیں اور نہ اسے پھر زندہ کیا جا سکتا ہے۔

نت نئے آلات نے جہاں موت کے فاصلے کو قدرے بڑھا دیا ہے وہیں دنیا نے ہر کونے سے مختلف سوالات اٹھائے ہیں اور معاملہ سلجھنے کی جگہ الجھتا جا رہا ہے۔

زمانہ قدیم میں سانس کی آمد و رفت رکی، اسے موت مان لیا گیا۔ پھر زمانہ آیا جب نبض ڈوبی اور قلب کی دھڑکن رکی تو اسے موت سمجھا گیا مگر جدید تصنع آلات اور ICU نیز CCU جیسے شعبے اور سہولتیں یعنی Ventilator جیسی جادوئی مشین نے مُردوں کو بھی جیسے جان بخش دی ہو۔ یہ سارے اسباب یکجا ہو کر لائف سپورٹ (Life Support) کہلانے لگے کیونکہ دماغی موت کے بعد بھی مشین کی مدد سے ایک نیم مردہ کو زندہ رکھا جا سکتا ہے جس کے ہٹا لینے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

بات سننے میں تو داستان الف لیلیٰ کا پتہ دیتی ہے لیکن اس میں ایسی الجھن و پیچیدگیاں ہیں کی یہ موضوع بحث بن چکا ہے۔ اب نہ یہ معاملہ صرف انفرادی بلکہ طبی، سماجی، اخلاق اور قانونی ہی نہیں بلکہ سیاسی بھی بن چکا ہے۔

مختصر الفاظ میں اگر دماغی موت کی تعریف بیان کرنی ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام دماغی اعمال کی غیر موجودگی جو کوما کی حالت میں تھی یا حبس دم (سانس گھٹنا) اور دماغی تنے سے متعلق تمام ردعمل کا غائب ہونا دماغی موت کہلاتا ہے۔ اسباب میں چوٹ، کھوپڑی کے اندر خون کا رساؤ، آکسیجن کی قلت، دواؤں کی زیادہ خوراک، غرقابی، ابتدائی دماغی رسولی، گردن توڑ بخار اور پھر خودکشی وغیرہ گنا جاتا ہے۔

دماغی موت کی تاریخ یا اس کا ذکر دو فرانسیسی ڈاکٹر مولارٹ (Mollart) اور گولان (Goulan) سے وابستہ ہے جنھوں نے اس حالت کو کوما کے پار (Coma De Passe) نام دیا اور کوما و کوما کے پار کے فرق کو سمجھا۔

کوما کے پار کو بعد میں متواتر نباتاتی حالت (PVS) یعنی Persistant

کہا جانے لگا۔ 1968 میں ہارورڈ اسکول کی عبوری کمیٹی نے دماغی موت کو ناقابل تغیر کوما یعنی Irreversible Coma کا نام دیا جس میں مریض کاملاً غیر اثر اور بغیر ردعمل کا ہو جاتا ہے۔ اگر Ventilator سے تین منٹ کے لیے بھی جدا کر دیا جائے تو خود سے سانس لینے کی حالت میں بھی نہیں رہتا اور رپورٹ میں ایسی حالت کو موت قرار دیا گیا ہے۔

کچھ سال بعد موہن داس اور شاؤ نے وضاحت کی کہ اندرون کھوپڑی بیماریوں سے دماغی تنا(Brain Stem) اس قدر بیکار ہو جاتا ہے کہ صحت یابی کی امید نہیں رہتی اور اسے دماغی موت کہا جاتا ہے۔

رائل میڈیکل کالج کی کانفرنس (1976) میں میمورنڈم پاس ہوا جس کی رو سے دماغی تنے کی دائمی موت کو ہی دماغی موت مانا گیا۔

لہٰذا موت کی تشخیص دماغی تنے کی موت کے تیقن کے بعد ہی ہو سکتی ہے اور اس حالت میں Ventilator ہٹایا جا سکتا ہے اور مریض کو مرنے دیا جا سکتا ہے۔

1960 کی شروعات میں حبس دم والا کوما (Apnoeic Coma) میں مبتلا لوگوں کو بھی دماغی موت کے زمرے میں لیا گیا۔ میمورنڈم پر کافی بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دماغی موت کی تشخیص سے انسانی تکلیف (Distress) کم ہوگی۔ ICU کا صحیح اور مفید استعمال ہوگا۔

جب اعضا کی پیوندکاری ناپید تھی اس وقت ICU (Intensive Care Unit) میں مریض کافی دنوں تک رہتے تھے۔ اب اعتماد کے ساتھ دماغی موت کی تشخیص شروع ہو گئی اور وقت کے ساتھ اعضا کی پیوندکاری کا رواج بڑھتا گیا اور اطبا نے Ventilator ترک کروانا شروع کیا۔ اب اس کی حدود پر بحث شروع ہو گئی ہے۔

دماغی موت کی تشخیص سے قبل کوما کے مختلف اسباب پر غور و خوض لازم ہوتا ہے۔ مثلاً کوما کے اسباب جیسے نشہ (الکحل)، دوائیں جو مرکزی عصبی نظام پر اثر انداز ہوتی ہیں، عضلات کو ڈھیلی کرنے والی دوائیں، درجہ حرارت میں کمی، شاک اور تحویلی بیماریوں کی چھان بین ضروری ہوتی ہے۔

1980 میں ہندوستان میں دماغی موت کے تصور پر عمل درآمد ہندوستانی پارلیمنٹ کی

قانون سازی اور پھر ہندوستانی گزٹ میں اس کے شامل ہونے کے بعد شروع ہوا جو برطانیہ کے بتائے گئے قانون پر منحصر ہے جو سادہ 'طبی' سب کو منظور اور قابل اعتماد ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ دماغی موت کیوں اتنی اہمیت کی حامل ہے؟ ''دماغی موت'' نہ صرف انفرادی بلکہ اخلاقی، سماجی، معاشی یا مالی، قانونی اور سیاسی اہمیت رکھتی ہے۔

انفرادی:

اب زندہ اور مردہ کے درمیان اگر فرق ہے تو دماغ کی موت سے ہے۔ چونکہ اب قلبی اور تنفسی عمل کو مشین کے ذریعہ قائم رکھا جاسکتا ہے خواہ اس فرد کی دماغی موت ہی کیوں نہ ہوگئی ہو اور بغیر سہارا زیست (Life Support) کے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

اخلاقی:

کسی انسان کی موت کے وقت دماغی موت کا معیار قائم کرنا ایک سماجی تشکیل کے دائرے میں ہے۔ چونکہ اعضا کا ہدیہ اور پیوند کاری اسی دائرے میں آتی ہے۔

سماجی:

کسی شخص کی موت صدیوں سے ایک سیدھا سادہ مسئلہ رہا ہے۔ قلب کی دھڑکن کا رکنا اور سانس لینے کے عمل کا بند ہونا موت کی نشانی سمجھی جاتی رہی ہے لیکن جدید ایجادات کے ذریعہ دماغی موت یا اعصابی موت کا معیار قائم ہونے پر اس کی سماجی حیثیت بھی بدل گئی ہے اور یہ ایک چیلنج سے کم نہیں۔

معاشی:

اگر ایک انسان کی دماغی موت ہوچکی ہے اور وہ لائف سپورٹ پر ہی زندہ ہے، مشین کے ذریعہ ہی اس کے قلب کی دھڑکن اور وینٹی لیٹر کے ذریعہ عمل تنفس قائم ہے جو ایک مہنگا عمل ہے تو ان اخراجات کی زیرباری کون برداشت کرے گا۔

قانونی:

''دماغی موت'' کی تشخیص ہے تو سہی لیکن پیچیدگیاں کافی ہیں وہ بھی قانونی۔ دماغی

موت سے متعلق پیچیدگی کا ایک مشہور زمانہ معاملہ Terri's Law ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

ٹیری شیاؤ (Terri Schiavo's) اور میکائیل شیاؤ (Michael Schiavo) خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔25 رفروری 1990 کی صبح ٹیری نے منجمد چائے (Iced Tea Diet) لے لی۔ ٹیری بولیمیا نام کی بیماری میں مبتلا تھی جس میں بھوک پر کنٹرول نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے جسم میں اچانک پوٹیشیم کی کمی ہوگئی اور اس کے قلب نے کام کرنا بند کر دیا۔ ٹیری کو اس سے سکتہ قلبی (Heart Attack) ہوا جس سے اسے قدرے دیر سے ہوش میں لایا گیا یا Revive کیا گیا۔ جب تک کہ اس کا قلب کام کرتا دماغ کو خون کے ذریعہ ملنے والی آکسیجن، گلوکوز اور معدنیات نہ مل سکیں۔ نتیجہ میں وہ بے ہوشی کی مختلف حالات سے گزرتے ہوئے دائمی نباتاتی حالت (Permanent Vegetative State) میں چلی گئی جس کا فلوریڈا کے ایک محتاج خانے میں علاج ہوتا رہا۔ ایسے مریض سانس بھی لے سکتے ہیں۔ آنکھیں کھول اور بند کر سکتے ہیں لیکن ماحول سے مانوسیت غائب ہوجاتی ہے۔ EEG میں کوئی برقی حرکات کے آثار نہ ملے۔ کاری بجا (Radio Active Isotopes) کے انجکشن سے اندازہ ہوا کہ خون کا دوران بھی نہیں ہے اور تب یہ بات واضح ہوئی کہ دماغی تنے کی یا دماغی موت ہوچکی ہے۔ اصل میں دماغی تنا بہت مختصر سا مقام ہے جہاں سانس لینے اور چھوڑنے کا نظام ہوتا ہے۔ اگر یہ خطہ ناکارہ ہوجاتا ہے تو انسان کبھی خود سے سانس نہیں لے سکتا اور ہوش میں نہیں آسکتا۔

9 بجے صبح مارچ 2009 کو ٹیری کی موت واقع ہوگئی۔ دو دن قبل ہی غذا کے لیے معدہ میں ڈالی گئی نلی کو نکال لیا گیا تھا۔ میکائیل کا کہنا تھا کہ ٹیری کی وصیت تھی کہ مجھے مصنوعی طریقے پر زندہ نہ رکھا جائے۔ ICU میں روزانہ دو ہزار ڈالر خرچ ہوتے ہیں اور محتاج خانے میں روزانہ 500 ڈالر۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طویل مدت (پندرہ سال) کا خرچ کون برداشت کرے گا۔

شیاؤ کے معالج اور اس کے کورٹ کے نمائندہ معالجین نے متفقہ طور پر یہ بیان دیا کہ دوبارہ آبادکاری کے کوئی امکانات نہیں۔ میکائیل چاہتا تھا کہ غذا کی نلی ہٹا دی جائے تا کہ ٹیری

آہستہ آہستہ سوئے تغذیہ (Malnutrition) اور نابیدگی (Dehydration) سے مر جائے گی چونکہ اس کی زندگی کے کوئی امکانات نہیں تھے۔

سیاست داں اس ہنگامے میں کود پڑے اور دخل اندازی شروع کر دی اور ہنگامہ بر پا کر دیا اور تب یہ مقدمہ مباحثہ اور مناقشہ کا موضوع بن گیا اور مشہور زمانہ ''ٹیری لا'' بنا جس میں بُش کی حکومت کو شیاؤ کے معدے میں نلی دوبارہ ڈالنی پڑی۔ یہ بڑا پیچیدہ اور خانوادہ کے لیے ٹیڑھا مسئلہ بن گیا۔ ظاہر ہے یہ سب کے لیے تکلیف دہ مسئلہ تھا (سوائے ٹیری کے) اور کانگریس نے فوراً فیڈرل کورٹ کو مداخلت کی اجازت دی اور صدر جارج بُش کو فوراً واشنگٹن واپس آ کر اس بل کو قانونی شکل دینی پڑی۔

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ یہی بُش جب ٹکساس کے گورنر تھے تو انھوں نے قانوناً اسپتال کو اختیار دیا تھا کہ (ٹیری جیسے واقعہ میں) لائف سپورٹ ہٹایا جا سکتا ہے چونکہ متاثرہ کے خاندان اسپتال بل ادا نہ کرنے کی صورت میں اسپتال کو حق ہے کہ گھر والوں کے اعتراض کے باوجود اسے ہٹا دیا جائے۔

اس دلچسپ مگر ہولناک واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ٹیری جدید آلات اور طبی تکنیک سے پندرہ سال زندہ رہی اور محض غذائی نلی معدے میں پڑی تھی جسے سائنس کا معجزہ کہا جا سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ ٹیری کی زندگی طویل کر دی گئی یا موت کو مؤخر کیا گیا؟

ایک نباتاتی سی حالت میں کوما میں پڑے مریض کی زندگی کی کیفیت کیسی ہوگی؟ کوما میں پڑا انسان اپنے آس پاس کے ماحول سے بے خبر ہوتا ہے۔ امریکہ میں ایسے 40-30 ہزار افراد PVS میں پڑے ہوں گے مگر ٹیری کے واقعہ نے انھیں بحث کا موضوع بنا دیا کہ کیوں نہ انھیں بھی مرنے کی اجازت مل جائے اور وقار کے ساتھ سکون سے مرنے دیا جائے۔

باوقار موت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ قتل بہ جذبہ رحم یا مرسی کلنگ یا پھر معاون خودکشی یا پھر دانستہ طور پر زندگی کو لاعلاج مرض کے نتیجے میں ختم کر دیا جائے۔

مذہبی:

مذہبی پیچیدگیاں تو اور بھی الجھی ہوئی ہیں۔ پوپ جان پال کے ایما پر علمائے کبار کی

اکیڈمی آف سائنس نے ورلڈ آرگنائزیشن فار فیملی کے اشتراک سے ایک میٹنگ ویٹیکن (Vatican) میں ''آثار موت'' کے عنوان سے منعقد کی اور پاپائے مقدس نے کہا کہ چرچ نے اصولی طور پر اس بات کی حمایت کی ہے کہ مردہ انسان سے زندہ انسان کے لیے زراعت کا عمل جائز ہے تاہم انھوں نے آگاہ کیا کہ زراعت یا پیوندکاری اس وقت قابل قبول ہے جب یہ عمل ضابطے کے دائرے میں ہو اور اس بات کی ضمانت ہو کہ انسان اور انسانی زندگی کا احترام ہو رہا ہو۔ پوپ نے اپنے پیش رو پوپ پائس 12 کا حوالہ دیا جنھوں نے کہا تھا کہ یہ اطبا کا فرض ہے جو موت کی تعریف اور لحہ واضح اور مختصر طور پر بیان کریں۔ پوپ جان پال نے اکیڈمی کی ہمت افزائی کی اور کہا کہ اس سلسلے میں ویٹیکن کی حمایت جاری رہے گی۔ موت کے آثار کے متعلق نتیجہ اخذ کرنے کے بعد قرارداد پیش کی گئی جس کے قابل ذکر نکتے یوں تھے کہ:

(1) چرچ اس روایت کو قائم رکھتا ہے کہ تمام انسانی زندگی کا پیدائش سے لے کر طبعی موت تک احترام کیا جائے۔

(2) کیتھولک چرچ سدا انسانی زندگی کی تباہی کے خلاف رہا ہے خواہ وہ اسقاط حمل ہو یا قبل از وقت موت دے دی جائے محض کسی دوسرے کی افزائش عمر کے لیے اور اعضا کی پیوندکاری کر دی جائے۔

اخلاقی طور پر دوسرے انسان کی بقا کے لیے کسی کو قتل کر کے یا موت دے کر دوسرے کی موت کو موخر کر دیا جائے یہ ہرگز جائز یا قابل قبول نہیں۔

(3) اعضا کی بڑھتی ضرورت اور فراہمی کے مدنظر زراعت کے لیے بغیر تصدیق موت دینا ہرگز قابل قبول نہیں۔

(4) کسی شخص کی موت ایک انفرادی واقعہ ہے لیکن یہ معاملہ معاشرے کا ہی ہے۔

پاپ پائس 12 نے کہا تھا کہ انسانی زندگی قائم رہتی ہے حتیٰ کہ اسے مصنوعی طریقے سے ہی قائم رکھا گیا ہو۔

(5) زندگی پر اثر انداز ہونے والے اعضا رئیسہ جو جسم میں ایک ہی ہیں انھیں صرف موت کے یقین کے بعد ہی نکالا جا سکتا ہے۔ اس کی ضرورت واضح ہے اس لیے اگر خلاف ورزی کی

ورزی کی گئی تو اعضا نکالنے کے بعد موت واقع ہوسکتی ہے۔لہٰذا یہ عمل قدرتی اور اخلاقی قانون کی خلاف ورزی میں شمار کیا جائے گا۔لہٰذا دماغی موت کا اعلان ہی موت سمجھ لینا کافی نہیں۔

(6) محض اعصابی جانچ کے بعد موت کی تشخیص یا اعلان جبکہ قلب و پھیپھڑے کام کر رہے ہوں مناسب نہیں ہے۔

(7) اس بات کا طبی اور سائنسی ثبوت ہے کہ دماغی عمل کا رک جانا موت کی نشانی نہیں ہوسکتا۔

(8) محض اعصابی جانچ جو مفروضہ پر منحصر ہے موت کی تشخیص نہیں ہوسکتی۔

(9) کوئی بھی قانون جو بنیادی طور پر قتل کی اجازت دے، حرکت شیطانی ہے۔

''میں اس بات کی تاکید کرتا ہوں کہ جو قانون معصوم جانوں کے حقوق کی پامالی کرتا ہو وہ مقبول نہیں لہٰذا میں پھر سے اپیل کرتا ہوں ان سیاسی رہنماؤں سے کہ ایسے قانون پاس نہ کریں جو کسی شخص کے وقار کو پامال کرتا ہو اور سماج کو کھوکھلا بناتا ہو۔''

(10) کسی انسان کی جان بچانے کے لیے دوسرے کی جان لینا جیسا کی منتقل اعضا میں احتمال ہے جائز نہیں۔ کچھ اچھا کرنے کے لیے شیطانی حرکت مناسب نہیں۔

دماغی موت کے مریضوں کا انجام:

دماغی موت کی تشخیص کے لیے جو اطبا ہوتے ہیں وہ کافی تجربہ کار ہوتے ہیں اور انھیں اس سلسلے کی ساری واقفیت ہوتی ہے اور تشخیص کے اصول وضوابط اور طریقے سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔

اعضا کے عطیہ کے لیے بھی کم از کم دو اطبا تجربہ کار ہوتے ہیں اور ان کا تعلق وصول کنندہ سے نہیں ہوتا۔

دماغی موت کا طبی اصول یہ ہے کہ سب سے پہلے اسباب معلوم کیے جائیں۔

ایک بار طبی لحاظ سے تشخیص ہو جائے تو اطبا و افراد خانہ کی سمجھ میں یہ بات آنی چاہیے کہ دماغی موت اور موت ایک ہی ہے۔ افراد خانہ پر ظاہر کرنا بہتر ہے بہ نسبت گول مول تشخیص کرے تاکہ اعضا کا عطیہ، پوسٹ مارٹم اور تجہیز و تدفین کا فیصلہ ہو پائے۔

لائف سپورٹ سسٹم ہٹالیا جاتا ہے تب ہی اعضا پیوندکاری کے لیے جدا کیے جاسکتے ہیں۔ دو استثنا کا ذکر لٹریچر میں ملتا ہے۔

(1) غیر معمولی حالات جیسے کوئی مریضہ تشخیص کے وقت حاملہ ہے تو حمل کو جاری رکھنے کی اجازت ہے جب تک جنین (Fetus) زندہ ہے۔ مصنفین میں ایک کی رائے ہے کہ جنین کی عمر 24 ہفتہ ہونی چاہیے۔

(2) اگر کسی کو مذہبی اعتراض ہو تب دماغی موت کا اعلان بے فائدہ ہے۔

اطبا دماغی موت کے اعلان کی حمایت میں جواز یہ دیتے ہیں کہ کوئی صاحب دماغی موت کے شکار ہو گئے۔ ماہرین نے تشخیص دے دی کہ دماغی موت ہو چکی ہے۔ طبی نقطہ نظر سے بھی طے ہو گیا کہ دماغی موت ہو چکی ہے۔ افراد خانہ کو بھی خبر دے دی گئی اور دریافت کیا گیا کہ کیا وہ اعضا کے عطیہ کے موافق تھے؟ افراد خانہ نے رضامندی دے دی اور دو قابل اطبا نے دماغی موت کی تشخیص و تائید کر دی۔ تو کم از کم 9 دوسرے مریض مرحوم کے اعضا سے مستفیض ہوں گے اور نئی زندگی شروع کر سکیں گے۔

دماغی موت اور اسلامی نقطۂ نظر:

دماغی موت کے تصور سے متعلق مملکت سعودی عرب اور دوسرے اسلامی ممالک نے مجلس فقہ اسلامی کی تیسری کانفرنس جو عمان میں 1986 میں واقع ہوئی جسے سعودی عرب کی علما کاؤنسل نے بھی منظوری دی۔ جس میں دماغی موت سے متعلق سوالات کے جواب اور لائف سپورٹ کے ہٹانے کے سلسلہ میں قرارداد پیش ہوئی اور پاس کی گئی۔

دماغی موت سے متعلق عمل بین الاقوامی سطح پر جتنے بھی قوانین ہیں ان کے مطابق تیار کیا گیا بلکہ قدرے سخت تر اور اسیر عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ یہ لائحہ عمل چار نکات پر منحصر ہے۔

(1) طبی طریقے اور جانچ اور مختلف طبی تفصیلات

(2) اوقات مشاہدہ خاص کر مختلف عمر کے مریضوں میں

(3) یقینی جانچ کا استعمال

(4) بعض مشکل مسائل جیسے دماغی موت کی تعریف خاص کر جب موت کے سبب کا علم نہ ہو۔

دماغی موت اور لائف سپورٹ کے متعلق اسلامی نقطہ نظر:

اس موضوع پر اسلامی لٹریچر بہت کم ہے۔ سعودی عرب کی ایک اہم شخصیت بکر ابو زید کی ہے جو بذات خود سابق نائب وزیر مملکت برائے عدل رہے اور ممبر علمائے کبار اور مسلم ورلڈ لیگ کے صدر تھے، ان کی کتاب ''فقہ النوازل'' ہے جس میں تمام جدید مسائل پر بحث اور شرعی قانون کا ذکر ہے۔

ان کے مقالے میں ایسے بیماری حالات اور لائف سپورٹ اور اس سے متعلق طبی اور فقہی نقطہ نظر پیش کیے گئے ہیں۔

انھوں نے اپنے مقالے کو پانچ فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔

(1) لائف سپورٹ سہارا زیست پر بحث

(2) طبی تعریف، موت اور علامات

(3) فقہی تعریف، موت اور علامات

(4) لائف سپورٹ کی حالت میں مختلف بیماریاں اور مختلف حالات

(5) ان مسائل پر فقہی قرارداد

پہلی فصل میں:

لائف سپورٹ کے سلسلے میں بحث کے دوران مختلف طبی اصطلاحات کا ذکر ہے جو سہارا زیست کے تعلق سے ہے اور سہارا زیست اصل میں ہے کیا اس کی پوری تفصیل ہے۔

دوسری فصل میں:

موت کی طبی تعریف اور علامات کے سلسلے میں قابل مصنف ڈاکٹر بکر ابو زید نے چار مسائل پر بحث کی ہے۔

(1) تاریخی پس منظر اور دماغی موت کا تصور

(2) بنیادی تشریح دماغ

(3) دماغی موت کا تصور

(4) دماغی موت کی علامات

اس سلسلے کی تمام گفتگو میں فقہی فیصلہ کے لیے دو اہم نکات کی طرف اشارہ ہے:

(i) طبی میدان میں دماغی تنے سے ہونے والی موت پر آراء میں اختلاف

(ii) بین اطباء علامات پر متفقہ رائے نہ ہونا

تیسری فصل:

فقہی تعریف موت اور علامات کے سلسلے میں ڈاکٹر بکر ابوزید فرماتے ہیں کہ تمام علما اور فقہا کا اجماع اس بات پر ہے کہ جسم سے روح کے جدا ہونے کو موت کہا جاتا ہے۔

امام غزالی کے قول سے جسے احیاء العلوم کے حوالہ سے بھی کہا گیا ہے جسم سے روح کی کامل علاحدگی کو موت کہا جاتا ہے۔ دو جملوں میں اس کی وضاحت کی ہے۔

(1) موت شرعی جسم سے روح کا جدا ہونا ہے

(2) حقیقتاً روح کے جسم سے کاملاً یعنی جسم کے ہر حصے سے نکل جانے پر زندگی کے آثار ختم ہوتے ہیں۔

حدیث کے حوالہ سے فقہ کے مطابق موت کے آثار میں جب جسم سے روح نکلتی ہے تو آنکھیں بھی اس کا پیچھا کرتی ہیں۔ انھوں نے فقہ کی بنیاد پر موت کے آٹھ آثار کا ذکر کیا ہے۔ اگر موت پر کسی کو شک ہے تو انسان مرنے کی تصدیق تک زندہ سمجھا جائے گا۔

چوتھی فصل:

لائف سپورٹ کے دائرے میں آنے والی مختلف بیماریوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں جن میں ڈاکٹر بکر نے Intensive Care کے امکانات بیان کیے ہیں۔

(1) انسان اگر خود بخود سانس لینے لگے اور قلب طبیعی طور پر دھڑکنے لگے تو لائف سپورٹ سسٹم کو ہٹایا جا سکتا ہے چونکہ وہ خطرے سے باہر ہے۔

(2) قلب کی دھڑکن رک گئی ہو اور لائف سپورٹ کے باوجود سانس لینا بھی رک گیا ہو تو ایسے میں لائف سپورٹ بلاشک ہٹایا جا سکتا ہے۔

(3) کسی شخص کی دماغی موت ہو چکی ہے لیکن دل ابھی دھڑک رہا ہے اور لائف سپورٹ کے تعاون سے سانس بھی لے رہا ہے لہٰذا عام طور پر اطباد ماغی موت کی وجہ سے اسے مردہ گردان دیتے ہیں اور لائف سپورٹ ہٹا دیتے ہیں۔

پانچویں فصل

اس امر کا فقہی حل ڈھونڈا گیا ہے۔

OOO

دماغی موت اور پیچیدگیاں
(BRAIN DEATH AND COMPLICATIONS)

دماغی موت کسی جرثومہ، بیکٹیریا یا وائرس یا وبائی اثرات کے تحت نہیں بلکہ حد سے گزر جانے والے کوما کے بعد ہوتی ہے۔ انسان 'کوما' کے بجائے ایک قسم کی نباتاتی حالت میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے لوٹنا آسان نہیں۔ بیشتر دارفانی سے کوچ کر جاتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ میں بہتری کے امکانات بھی پائے گئے ہیں۔

میں نے دماغی موت کی اہمیت، انفرادی، اجتماعی، سماجی، اخلاقی، معاشی یا مالی، قانونی اور سیاسی پیچیدگیوں پر روشنی ڈالی ہے نیز شرعی اور مذہبی حیثیت کا بھی ذکر کیا ہے جس میں دنیا کے دو اہم مذاہب یعنی عیسائی اور اسلامی نقطہ نظر پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی۔

میں چاہوں گا کہ آپ کو بعض اطبا کرام کے خیالات سے آشنا کراؤں جو براہ راست دماغی موت کی تشخیص اور فیصلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دنیا بھر کے سائنس داں، اہل علم، اطبا اور ماہرین نفسیات کا آپس میں اب تک اتفاق نہیں اور ماہرین کی ساری برادری ایک عجیب چپقلش کے دوران بے دھڑک اعضا کی پیوندکاری کا کام کر رہی ہے۔ ہر ملک کا اپنے سلسلے میں الگ الگ رویہ ہے اور قانون ہے۔ بہرحال دماغی موت، اس کی تشخیص اور اس پر کارروائی بحث کا

موضوع ہے۔ اگر میں اپنے اس سلسلہ وار مضمون کا عنوان ''دماغی موت۔ موت نہیں'' دے دوں تو بے جا نہ ہوگا۔

میں تین تا چار فروری 2003 کی اس میٹنگ کا ذکر کروں گا جسے پوپ کی ایما پر ویٹیکن میں منعقد کیا گیا۔ موضوع تھا ''موت کے آثار'' جس میں دنیا بھر کے ماہرین نے اپنی رائے پیش کی۔ ظاہر ہے تمام اراکین وشرکا کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا۔ پوپ جان پال نے ماہرین کو اس لیے بلایا تھا کہ اس موضوع پر سیر حاصل بحث ہو اور موت کے آثار کی سائنٹفک نقطہ نظر سے تصدیق ہو کیونکہ دماغ سے متعلق آثار کی بنا پر بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ دماغی موت کی اصطلاح سب سے پہلے فرانس کے دو ماہرین نے Coma De Passe سے شروع کی تھی جو بالآخر دماغی موت اور پھر دماغی تنے کی موت تک پہنچی۔

واقعہ یوں ہے کہ 1966 میں دماغی موت کے تعین کے لیے ''ہارورڈ کا معیار'' امریکن میڈکل ایسوسی ایشن کے جریدے میں ''اٹل کوما کی تعریف'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ناکافی اعداد شمار کے ساتھ یہ مقالہ شائع ہوا جس کی بنا پر روم میں ہونے والی کانفرنس کے شرکا کی اکثریت نے ہارورڈ کے معیار کو سائنسی بنیاد پر کالعدم قرار دیا۔

پھر 2002 میں بین الاقوامی سروے (Survey) کے بعد علم عصبیات (Neurology) کے جریدے میں اصطلاح ''دماغی موت'' شائع ہوئی اور بین الاقوامی برادری نے اسے قابل قبول گردانا لیکن تشخیص کے معیار پر کوئی عالمگیر موافقت نہیں ہو پائی۔ اور اب تک اس معاملے میں بین الاقوامی اتفاق رائے نہیں ہے نیز اور تشخیص کے سلسلے میں مزید آثار جڑتے جا رہے ہیں۔

1968 سے 1978 تک کم سے کم 30 مختلف معیار شائع ہوئے اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اب تک ہے۔ ہر نیا معیار گزشتہ معیار سے سہل ہی ہوتا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی قابل قبول نہ ہوسکا۔

تشخیص موت کے نئے معیار کو قائم کرنے میں یا پرانے معیار کو بدلنے میں جو ایک زمانہ سے رائج ہے اور معروف ہے (حرکت قلب رک جائے، سانس کی آمد ورفت بند ہو جائے

ردعمل کم ہو جائے تو موت کہلائے گا) اسے ایک نئی مہم کے ساتھ لاگو کرنے کے دوران ایک ناخوشگوار ماحول پیدا ہو گیا۔ مختلف ماہرین نے محسوس کیا کہ ''سقراطی حلف نامہ (Hippocratic Oath) '' کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ دماغی موت کے منوانے اور نئے معیار کو قبول کروانے سے اعلیٰ ظرف پیشے کی ساکھ پر آنچ آئے گی۔

پروفیسر رابرٹ اسپے مین (Robert Spaemann) میونخ، جرمنی کے مانے ہوئے فلسفی نے پوپ پائس 12 کے الفاظ کو دہراتے ہوئے کہا کہ انسان کے اعضا رئیسہ میں مصنوعی طریقے سے حیات باقی رکھی گئی ہو اس کے باوجود زندگی کے آثار باقی رہتے ہیں۔ ان کے قول کے مطابق سانس کا رکنا، قلب کی دھڑکن کا رکنا، آنکھوں میں تبدیلیاں وغیرہ ایک زمانے سے موت کی نشانی سمجھی جاتی رہی ہے لیکن ''ہارورڈ معیار'' نے سرے سے یہ معیار ہی بدل دیا ہے۔ سائنس کے مفروضات سے زندگی اور موت کے فرق کو نہیں سمجھا سکتا۔ درحقیقت ایک زندہ انسان کو مردہ قرار دینا ان تمام انسانی ادراک کو کالعدم قرار دیتا ہے۔

موت کی تعریف کے لیے ایک نئی سفارش مختلف النوع اولیت منعکس کرتی ہے جسے اب مرنے والے کے حق کی بات نہیں بلکہ اسے قبل از وقت مردہ قرار دینے کی مہم جوئی ہو رہی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے کا خیال کیا جا رہا ہے۔ مرتے ہوئے انسان کو جلد سے جلد مردہ قرار دیے جانے کے پیچھے دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔

(1) سہارا زیست (Life Support) کے تسلسل کو ہٹانے کے لیے قانونی استثنا چونکہ افرادِ خانہ اور معاشرہ کے لیے وہ ذاتی بوجھ کس سبب ہے۔

(2) مرتے ہوئے انسان کے جسم سے کارآمد اعضا نکال کر دوسرے انسان کی جان بچائی جا سکتی ہے۔

یہ دونوں ہی دلیلیں دماغی موت کے مریض کے مفاد میں نہیں چونکہ ایسا کرنے والوں کا مطمع نظر کسی سے چھٹکارا پا کر جلد سے جلد اپنا مفاد حاصل کرنا ہے۔

اسپے مین کے مطابق جرمنی میں فلسفی، قانون داں اور طبی ماہرین دماغی موت کو موت نہیں مانتے بلکہ ایک جرمن ماہر بیہوشی کا قول ہے کہ:

''دماغی موت والے لوگ مردہ نہیں بلکہ وہ مر رہے ہوتے ہیں''

ڈاکٹر پاؤل بائرنے (Paul Byrne) جو ایک جانے مانے امریکی ماہر نومولود (Neolatologist) اس بات کے شاہد ہیں کہ جب دماغی موت کے مریض کے اعضا جسم سے جدا کیے جاتے ہیں تو سارے آثار حیات موجود ہوتے ہیں جیسے طبعی درجہ حرارت، بلڈ پریشر، حرکت قلب، اعضا رئیسہ کے افعال جیسے جگر اور معدہ سبھی کام کر رہے ہوتے ہیں اور عطیہ کنندہ وینٹی لیٹر کے ذریعہ سانس لے رہا ہوتا ہے۔

انھوں نے یہ مزید بتایا کہ جب مریض مرتا ہے تو اعضا رئیسہ جلد ہی خراب ہو جاتے ہیں اور ابتری کی حالت میں جانے لگتے ہیں۔

حقیقی موت کے بعد جسم کے اکیلے اعضا خصوصاً جگر اور دل کی پیوند کاری ممکن نہیں۔ ایسے میں اعضا کی پیوند کاری اکثر مغربی ممالک میں قانونی اجازت رکھتی ہے نیز بعض ترقی پذیر ملکوں جیسے برازیل میں بھی مروج ہے۔

لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اخلاقی اجازت ہے کہ دوسروں کی زندگی کو بچانے کے لیے ایک شخص کی زندگی ختم کردی جائے؟

پوپ جان پال II نے تاکیداً کئی بار کہا ہے اور 4رفروری 2003 کو'عالمی یوم بیماران' کے موقع پر پیغام بھیجا کہ ''کسی شخص کو قتل کر کے دوسرے کی جان بچانا ہرگز قابل قبول نہیں۔''

پاؤل بائرنے فرماتے ہیں کہ ''علم طب میں ہم لوگ زندگی کی حفاظت کرتے ہیں، زندگی کو تحفظ اور طول دیتے ہیں اور موت کو التوا دیتے ہیں۔ ہمارا مقصد جسم و روح کو یکجا رکھنا ہے۔ جب اعضا رئیسہ میں سے ایک کام کرنا بند کر دیتا ہے تو موت واقع ہو سکتی ہے مگر طبی مداخلت سے جز رسیدہ اعضا کا فعل و عمل بحال کیا جا سکتا ہے اور طبی آلات کی مدد سے زندگی کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

دماغ کا عمل اگر محسوس کیا جاتا ہے کہ رُک گیا ہے یا جسم کے دوسرے اعضا کام کرنا بند کر چکے ہیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس عضو کی تباہی ہو گئی اور اس بنا پر کسی کو مردہ قرار دیا جائے۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے دماغی موت کے معیار کی مدافعت اور طرفداری بھی کی ہے۔

ڈاکٹر اسٹیورٹ ینگر (Stewart Younger) جو اوہائیو (Ohio) یونیورسٹی میں استاد ہیں، کہتے ہیں کہ میں مانتا ہوں کہ دماغی موت میں مبتلا عطیہ دہندہ زندہ ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اعضا کی زراعت رکاوٹ ہے۔ چونکہ دماغی موت میں مبتلا مریض کی زندگی کی کیفیت و ماہیت اتنی ابتر اور پست ہوتی ہے کہ اس سے بہتر ہے کہ کسمپرسی کی حالت میں زندہ رہیں۔ ان کے اعضا کی زراعت ضرورت مند مریض کی زندگی میں توسیع کے لیے کی جانی چاہیے۔

ایک فرانسیسی سرجن ڈاکٹر دیدیر ہوسن (Didier Houssin) جو ماہر زراعت اعضا ہیں، انھوں نے دماغی موت کی تشخیص میں پیدا ہونے والی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ دنیا بھر میں چونکہ مختلف معیار قائم ہے جس کی بنا پر یہ اختلافات ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ''موت ایک طبعی حقیقت ہے، ایک حیاتیاتی فعل ہے، ایک فلسفیانہ سوال ہے لیکن یہ ایک سماجی حقیقت بھی ہے۔ کسی سماج کے لیے یہ مشکل ہے کہ ایک انسان ایک جگہ زندہ کہا جارہا ہے تو دوسری جگہ اسے مردہ قرار دیا جارہا ہے۔ تاہم زراعت اعضا کا طرف دار ہونے کے باوجود سماج میں اس بات کو اہمیت دینی چاہیے کہ ڈاکٹروں پر اعتماد رکھا جائے۔

ایک دوسرے فرانسیسی طبیب جیاں دیدیر ونسنٹ (Jean Didier Vincent) کا کہنا ہے کہ دماغی موت میں دماغ کی ناقابل تنسیخ تباہی ہوجاتی ہے اور وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ ایک حاملہ عورت کی دماغی موت ہوگئی اور اسے سہارا زیست کے ذریعہ زندہ رکھا گیا پھر بھی اس کی چھاتی میں دودھ بن رہا ہے تو انھوں نے اس بات کو مانا کہ دودھ بن سکتا ہے چونکہ یہ ایک طبعی ردعمل کی وجہ سے ہورہا ہے نہ کہ اس کا تعلق زندگی سے ہے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ دودھ کا بننا دماغ کے غدہ نخامی (Pituitary Gland) کے ذریعہ بھیجے گئے اشارات کی وجہ سے ہوتا ہے نیز پستان کا بڑھنا بھی اسی طرح ہوتا ہے جس کے لیے ایک فعال دماغ درکار ہے۔ جس کا جواب انھوں نے دیا کہ ممکن ہے قلیل مقدار میں مخصوص ہارمون دماغ میں بن رہا ہو۔

حبس دم (Apnea Test) ایک ایسا ٹسٹ ہے جسے دماغی موت کی جانچ کے لیے کیا جاتا ہے جس میں دس منٹ کے لیے Ventilator کو ہٹا کر دیکھا جاتا ہے کہ آیا دماغی موت میں مبتلا شخص بغیر Ventilator رہنے کی تاب رکھتا ہے یا نہیں۔

ڈاکٹرسی سے روکوئمبرا (Cicero Coimbra) نے جوفیڈرل یونیورسٹی ساؤپاؤ برازیل میں ماہر طبی عصبیات ہیں، اپنے مقالہ میں اس بات کی شدید مذمت کی کہ حبس دم جیسی جانچ ایک بے رحمانہ عمل ہے۔ چونکہ دماغی موت کی تشخیص کے لیے مریض کا مشینی سہارا تنفس کم از کم دس منٹ کے لیے ہٹالینا اور یہ معلوم کرنا کہ آیا وہ بغیر مشین کے سانس لے سکتا ہے یا نہیں مناسب نہیں۔ چونکہ یہ ٹسٹ دماغی صدمے کے مریض کے لیے مہلک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔

دماغی صدمات کے مریضوں کی کثیر تعداد جو گہرے کوما میں ہوتے ہیں وہ دوبارہ زندہ ہوکر اپنی طبعی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ان کے اعصاب ممکن ہے خاموش اور سکتے میں ہوں اور ضائع نہ ہوئے ہوں۔ چونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جزوی طور پر دماغ کو خون نہیں پہنچتا جس کے لیے ایک اصطلاح Schaemic Penumbra استعمال ہوتی ہے۔ جب دماغی موت کی تشخیص ہوئی اس وقت اس سے لوگ ناواقف تھے تاہم حبس دم کی جانچ کو اہمیت ہنوز دماغی موت کی تشخیص کے لیے حاصل ہے خواہ اس سے دماغ کو پہنچنے والا خون ساقط کیوں نہ ہوجائے یا سکتہ قلبی ہوجائے۔

حبس دم کی جانچ میں اپنے پھیپھڑے کی کاربن ڈائی اکسائیڈ مریض نکال نہیں سکتا جو دل کے لیے زہر کا کام کرتی ہے۔ چونکہ خون میں CO_2 یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ کی کثافت بڑھتی جائے گی اور نتیجتاً بلڈ پریشر کم ہوگا۔ دماغ کو کم خون کا سامنا کرنا پڑے گا اور دماغ کے نسیجوں کو مزید نقصان پہنچے گا۔ دماغ میں موجود سانس لینے کے مرکز کو بھی خون نہ پہنچے گا اور ان تمام جانچ میں نقصان ہی نقصان ہے۔

اس ٹسٹ میں سکتہ قلبی جو ناقابل تنسیخ ہے Cardiac Arrhythmia یا Myocardial Infarction اور دوسرے کئی حادثات رونما ہوسکتے ہیں اور اس جانچ کے دوران یا جانچ کی تکمیل سے پہلے دماغ کو مزید نقصان پہنچ سکتا ہے۔

ڈاکٹر کوئمبرا کے مطابق حبس دم کی جانچ کو غیر اخلاقی اور غیر قانونی قرار دینا چاہیے کیونکہ یہ انسانیت سوز طبی عمل ہے۔ اگر افراد خانہ کو ساری صورتحال اور بے رحمانہ طرز عمل بتادیا جائے تو اکثریت اس جانچ کی اجازت ہی نہ دے۔ اپنے اس دعوے کو نہایت مناسب مثال دے کر انھوں نے سمجھایا کہ جب کسی کو ہارٹ اٹیک ہوتا ہے تو ایمرجنسی میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس وقت

اس سے Stress Test نہیں کرایا جاتا اور ہارٹ فیلیر کی تصدیق نہیں کی جاتی بلکہ مریض پر خاصی توجہ دی جاتی ہے تاکہ مزید قلب پر اثر نہ پڑے۔ اس کے برخلاف دماغی صدمات میں مبتلا مریض کو حبس دم کی جانچ کرائی جاتی ہے۔ ایسے عضو جو پہلے ہی صدمہ کا شکار ہے مزید صدمہ پہنچانا غیر مناسب ہے چونکہ اس میں مریض کی جان بھی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر یوشیو واتانابے (Yoshio Watanabe) ناگویا، جاپان میں ماہر امراض قلب ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر حبس دم (Apnea Test) نہ کیا جائے تو 60% امید ہے کہ مریض طبعی زندگی پر لوٹ آئے اور بجائے ٹسٹ کے وقت پر علاج کیا جائے۔

دماغی صدمہ والے مریض کی ممکنہ صحت کی بحالی کے سلسلہ میں ڈاکٹر ڈیوڈ ہل (David Hill) جو ایک برطانی ماہر بیہوشی ہیں، کہتے ہیں دماغ میں کچھ عمل اور اس کا کچھ فعل باقی رہتا ہے ایسے میں یہ اعلان کردینا کہ وہ شخص مرچکا ہے محض زندہ اعضا کی حصول کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ ایسا فیصلہ ہے جسے ہم مرنے والے کے حق میں نہیں بلکہ سقراط کے نظریہ کے بالکل برعکس ہے اور وہاں اعضا کے وصول کنندہ کے مفاد کی بات کرتے ہیں۔

ایک فریب، ایک دھوکہ:

ڈاکٹر ڈیوڈ ہل کو ماضی قریب کی باتیں یاد ہیں جب اعضا رئیسہ کی پیوندکاری شروع کے دنوں میں ناکام اس لیے رہی کہ اعضاء مردہ جسم سے نکال کر زراعت کی جاتی تھی لیکن دماغی موت کا معیار قائم ہونے پر یہ مشکل دور ہوگئی۔ چونکہ سہارا زیست کو ہٹائے بغیر اعضا رئیسہ کو نکالا جانے لگا، قانونی پیچیدگیوں کا خیال کیے بغیر یہ کام شروع ہوگیا جو بالآخر عام ہوچکا ہے۔

یہ بھی تعجب خیز ہے کہ عوام الناس نے دماغی موت کا معیار قبول کرلیا ہے۔ ڈاکٹر ہل کہتے ہیں کہ ممکن ہے لوگوں نے اسے اس لیے قبول کیا چونکہ بڑے پیمانے پر زراعت و پیوندکاری اعضا کی تشہیر ہوئی مگر المیہ یہ ہے کہ عوام اب بھی تمام طریق کار سے لاعلم ہے۔ عام طور پر لوگ یہ نہیں جانتے کہ اعضا سہارا زیست کے ہٹانے کے بعد نہیں بلکہ قبل ہی نکال لیے جاتے ہیں۔ یہ بھی انھیں معلوم نہیں کہ اکثر عطیہ کنندہ سے اعضا نکالتے وقت بیہوش بھی کرنا پڑتا ہے۔

جب اس طرح کی باتیں باہر آنے لگیں تو رشتہ داروں اور اہل خانہ نے عطیہ دینے سے انکار شروع کر دیا۔

2004 کے ایک مطالعہ میں یہ بات عیاں ہوئی کہ 1992 میں %30 لوگوں نے انکار کیا اور 2004 میں پہنچتے پہنچتے انکار کرنے والوں کی تعداد %44 ہوگئی۔

ڈاکٹر ہل نے یہ انکشاف کیا کہ جب اہل خانہ نے دیکھا کہ ان کے رشتہ دار کے زندہ رہتے ان کے اعضا نکالے جارہے ہیں تو مختلف قسم کے شکوک وشبہات کھڑے ہونے لگے اور رشتہ داروں نے اعضا نکالنے کی اجازت دینا بند کر دیا۔

جسم کو روح سے یک لخت الگ کر دینا
یہ تو وہ کام ہے جس کو نہ انسان کرے
(سلمیٰ شاہین)

میں ایک بار پھر سورۃ الزمر کی بیالیسویں آیت کا ترجمہ لکھ کر اپنے قارئین سے اس پر غور رفکر کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

"اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ـ"

(سورۃ الزمر، آیت:42)

(''اللہ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی انھیں ان کے نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے، پھر جن پر موت کا حکم لگ چکا ہے انھیں تو روک لیتا ہے اور دوسری (روحوں) کو ایک مقرر وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ غور کرنے والوں کے لیے اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔'')

ooo

اعضا کا عطیہ
(ORGAN DONATION)

دماغی موت (Brain Death) پر مفصل گفتگو کے بعد دو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

(1) کوما سے نہ ابھرنے کے بعد نباتاتی حالت (Vegetative State) میں چلے جانے کے اسباب دماغی موت ہو سکتی ہے لیکن دماغی موت کے باوجود لائف سپورٹ کی مدد سے انسان کو کئی کئی سال زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ مشکل یہ آتی ہے کہ لائف سپورٹ ایک گراں نعم البدل ہے، آخر اس کے اخراجات کون برداشت کرے۔

(2) دماغی موت میں مبتلا انسان بہت کم فعال زندگی کی طرف لوٹتا ہے۔ ایسے میں لائف سپورٹ کے گراں اختیار کو اپنانے سے بہتر ہے کہ دماغی موت کو حقیقی موت میں بدل کر اسے دائمی نیند فراہم کر دی جائے اور اس کے اعضا کو کسی ضرورت مند کے جسم میں منتقل کر دیا جائے تا کہ ایک ضرورت مند انسان جو موت و زیست کی لڑائی محض کسی عضو کے ناکارہ ہو جانے سے ہار رہا ہے۔ اسے وہ عضو مل جائے اور وہ کچھ عرصہ مزید زندگی بسر کر لے۔

سننے میں یہ بات کچھ اٹ پٹی مگر معقول لگتی ہے۔اس سوچ کے پیچھے ترقی یافتہ ملکوں کی معاشرتی زندگی، تہذیب وتمدن اوران کے طرزِ فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔ترقی یافتہ ملکوں میں جن میں امریکہ اور برطانیہ سرفہرست ہیں وہاں کا ماحول اورطرز زندگی بالکل مختلف اور مادہ پرست ہیں۔ خاندان نوعمری میں بکھر جاتا ہے۔ بچے بالغ ہوتے ہی والدین سے جدا ہوجاتے ہیں۔والدین کا جب آخری وقت ہوتا ہےتو ان کے ساتھ کوئی نہیں ہوتا۔پس انداز رقم اورجتن کی کمائی ان کی امید ہوتی ہے۔موت یاتو گھر، تیمارخانوں یاہوٹلوں میں ہوتی ہے۔ایسے میں اگر کوئی کوما میں چلا جائے تو اس کی دیکھ بھال تیمارخانوں یااسپتالوں میں ہوتی ہے۔ظاہر ہے ICU کے اخراجات ہزاروں ڈالر روزانہ کے ہوتے ہیں اور بل کی ادائیگی پس انداز رقم سے ہوتی ہے۔ادھر وارثین بھی اس امید میں ہوتے ہیں کہ حرکت قلب رکےاورتر کہ حاصل ہوجائے۔

ان دونوں مندرجہ بالانتیجوں سے دنیا کےاس خطہ یعنی مشرق کےلوگ شاید متفق نہ ہوں چونکہ ہم لاکھ ترقی پذیر یا غیرترقی یافتہ ملکوں کے رہنے والے ہوں جس دھرم اورجس مذہب کے بھی ماننے والے ہوں ہم میں اخلاقی قدریں ان ترقی یافتہ ملکوں کے رہنے والوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں کےلوگ خالص مادہ پرست ذہنیت کے ہوتے ہیں اورانہی مادہ پرستی کی بنا پر سوچ اورفکر منحصر ہے۔

ہم جس مذہب کے ہوں جس دھرم کے ماننے والے ہوں ہمارے اعزّ او اقارب، رشتہ دار ہمیں عزیز ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا وجود اور سایہ ہمارے لیے باعث رحمت اورتقویت ہے۔ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ خواہ کتنی بھی مالی مشقت ہواور تنگی ہواور کسی طرح کا خرچ ہو اپنے عزیزوں کے علاج وتیمارداری میں کسر باقی نہیں رکھتے اوران کا سایہ بوجھ نہیں بنتا۔

ہم پرانی کہاوت ''جب تک سانس تب تک آس'' پر یقین رکھتے ہیں اور ہرگز جذباتی طور پر اس طرح کا فیصلہ نہیں کرتے۔مریض جب کوما میں چلاجاتا ہے یانباتاتی حالت میں پہنچ جاتا ہے تو دعائیں، وردو وظائف، پرارتھنائیں، یگ اور پرے ارز شروع ہوجاتی ہیں اور خالق سے دعائے حاجات شروع ہوجاتی ہے۔ایسے میں اگر موت آ ہی گئی تو صبر اور مرنے والے کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔سائنس دانوں کا ترک ہے کہ اگر دماغی موت کے مریض کے اعضا کو

نکال کر کسی حاجت مند کے جسم میں منتقل کر دیا جائے تو دوسرے کی جان بچائی جا سکتی ہے۔مگر یہ کام مرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

اعضا کی منتقلی، اس کی زراعت اور پیوند کاری طبی دنیا کا ایک مختلف شعبہ ہے جو ہیجان خیز، محیر العقول، دلچسپ اور ہم اسے عبرتناک بھی کہہ سکتے ہیں۔آج اسی موضوع پر گفتگو ہوگی۔ کہانیوں قصوں، حکایات و روایات میں اس علم کے واقعے اکثر سننے کو ملتے ہیں اور زمانہ قدیم سے اس شعبۂ جراحت کو جوڑا جاتا ہے مگر سائنس اور تجربہ کی سند جب آئی تو دستاویزی شکل میں اس شعبے نے بیسویں صدی میں ابتدا کی اور سنگ میل قائم ہوئے تاریخی پس منظر میں جانے سے بہتر ہے کہ ان سنگ میل پر ایک نظر ڈال لیں۔

1905 ۔ پہلی کامیاب قرنیہ کی زراعت Eduard Zim

1954 ۔ پہلی کامیاب گردہ کی زراعت Joseph Murray امریکہ

1966 ۔ پہلی کامیاب لبلبہ کی زراعت Richard & W.Kelly امریکہ

1967 ۔ پہلی کامیاب جگر کی زراعت Thomas Starzl امریکہ

1981 ۔ پہلی کامیاب دل پھیپھڑے کی زراعت Christiaan Barnard جنوبی افریقہ

1983 ۔ پہلی کامیاب پھیپھڑوں کے ٹکڑے کی زراعت Brucc Reitz امریکہ

1986 ۔ پہلی کامیاب پھیپھڑے کی زراعت Jocl Cooper کناڈا

1998 ۔ پہلی کامیاب زندہ عطیہ سے لبلبہ کی زراعت David Sutherland

1998 ۔ پہلی کامیاب ہاتھ کی زراعت فرانس

2005 ۔ پہلی کامیاب چہرے کی زراعت فرانس

2006 ۔ پہلی کامیاب جبڑے اور ہڈی کے گودے کی زراعت Eric Gcndcn امریکہ

2008 ۔ پہلی کامیاب دونوں بازو کی زراعت Edger Bicmer جرمنی

2008 ۔ پہلی کامیاب مادہ بیضہ کی زراعت

2008 ۔ پہلی کامیاب سانس کی نلی کی خود مریض کے اسٹم سل سے زراعت

زراعت اعضا سے مراد:

اعضا کی زراعت سے مراد ہے کہ کوئی جسمانی عضو ایک انسان سے دوسرے انسان میں منتقل کر دیا جائے تا کہ ناکارہ اور بے کار عضو کے بدلے عطیہ کردہ عضو کو لگا کر کام کے لائق بنایا جا سکے۔ عطیہ کرنے والا زندہ بھی ہو سکتا ہے اور مردہ بھی۔

دل، گردہ، جگر، پھیپھڑا، لبلبہ، اعضا تناسل اور آنتیں عام طور پر منتقل کی جاتی ہیں۔ اور بعض نسیج جیسے ہڈیاں، وتر، قرنیہ، دلوں کے صمام، وریدیں، بازو اور کھالیں بھی پیوند کی جاتی ہیں لیکن سب سے عام اور سہل گردے کی منتقلی ہے۔

دنیائے طب میں اعضا کی منتقلی کا عمل نہایت پیچیدہ اور مبازرت طلب ہوتا ہے۔ چونکہ سب سے بڑی مشکل اعضا کے پیوندکاری کے بعد اس کی کارکردگی پر منحصر ہے چونکہ ایک جگہ سے یا ایک شخص سے عضو نکال کر دوسرے شخص کے جسم میں پیوندکاری بڑا ہی صبر آزما عمل ہوتا ہے۔ بیشتر ملکوں میں مناسب اعضا کی کم یابی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں زراعت کے بہتیرے قوانین، سہولتیں اور طریقے ہیں۔

اعضا کی منتقلی نے اسی وجہ سے اہم حیاتیاتی اخلاقیات کے سوال اٹھائے ہیں جیسے موت کی تعریف، اقرارنامہ، اخراجات وغیرہ۔

پیوندکاری کی قسمیں:

(1) پیوند خود (Auto Graft) یعنی عضو یا نسیج جو اسی شخص کے کسی اور حصہ سے منتقل کیا جائے یا پیوندکاری کی جائے جیسے جلد کا یا وریدوں کا کچھ حصہ وغیرہ۔

(2) پیوند دگر (Allo Graft) یعنی عضو یا نسیج یا اس کے کچھ حصے اسی نوع کے کسی دوسرے انسان میں پیوند کیا جائے۔

(3) ہم پیوند (Isograft) جہاں Genetically Identical عطیہ قبول کرنے والا ہو یعنی جایاں بھائی یا بہن۔

(4) پیوند حیوانی (Nanograft) جہاں اعضا کی منتقلی مختلف النوع کے درمیان جیسے سور کے دل سے والو نکال کر انسان کے دل میں لگایا جائے یا لبلبہ کے خلیے جانوروں سے حاصل کر کے انسانوں میں لگائے جائیں۔

(5) زراعت منقسم(Split Transplant) کبھی کبھی مردہ عطیہ دہندہ کے عضو جیسے جگر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو اشخاص میں منتقل کیا جائے۔

جسم کے اہم اعضا و نسیج جو منتقل ہوتے ہیں:

(1) سینے کے اعضا

دل۔ صرف مردہ عطیہ دہندہ سے

پھیپھڑے۔ مردہ اور زندہ دونوں ہی سے

دل/ پھیپھڑے۔ مردہ سے

(2) شکم کے اعضا

گردہ۔ زندہ مردہ دونوں سے

جگر۔

لبلبہ۔ صرف مردہ سے

آنتیں۔ زندہ و مردہ سے

معدہ۔ مردہ سے

(3) نسیج، خلیات و مائع مادّے

ہاتھ۔ مردہ سے

قرنیہ۔ مردہ سے

جلد و چہرہ۔ آٹو گرافٹ

لبلبہ کے خلیات۔ زندہ و مردہ سے

ہڈیوں کے گودے۔ زندہ اور آٹو گرافٹ

خون اور خلیے۔ زندہ اور آٹو گرافٹ

وریدیں۔ آٹو گرافٹ اور مردہ سے

دل کے والو۔ مردہ، زندہ اور جانوروں سے

ہڈیاں۔ مردہ اور زندہ دونوں سے

عطیہ کنندہ کی اقسام:

(1) زندہ عطیہ دہندہ:

وہ عطیہ دہندہ ہوتے ہیں جو خود زندہ ہوتے ہیں اور قابل تجدید نسیج، خلیے اور مائع مادے جیسے خون اور جلد یا کوئی عضو یا عضو کا حصہ جو دوبارہ اُگ سکے یا باقی ماندہ حصہ میں اتنی طاقت ہو کہ کامل عضو کا بوجھ برداشت کر سکے جیسے سالم گردوں میں سے ایک کا عطیہ، جگر کے ایک ٹکڑے یا معدہ کا ایک حصہ عطیہ کرنے والے ہوں۔

(2) مردہ عطیہ دہندہ:

وہ عطیہ دہندہ جو اپنی زندگی میں ہی اعضا کے مرنے کے بعد عطیہ کرنے کا اعلان کر چکے ہوں اور کاغذات پر دستخط کر چکے ہوں اور ان کے اعضا رئیسہ لائف سپورٹ کی مدد سے زندہ رکھے گئے ہوں یا کسی اور مشینی مدد سے زندہ رکھے گئے ہوں تا کہ صحیح وقت پر پیوندکاری کیے جاسکیں۔

دماغی موت کے علاوہ بعض ایسے بھی عطیہ دہندہ ہیں جو قلبی موت کے بعد عطیہ دینے والے ہوں جو Donation After Cardiac Death (DCD) یا Non Heart Beating Donors (NHBD) بھی کہے جاتے ہیں۔ مگر ایسے عطیہ دہندہ کے اعضا دماغی موت سے مرنے والوں کے مقابلے ضعیف اعضا پائے جاتے ہیں لیکن اعضا کے فقدان اور اشد ضرورت کے تحت یہ بھی رائج ہیں۔

(3) زندہ عطیہ دہندہ(Living Related Donors):

ایسے عطیہ دہندہ جو اپنے عزیز و اقارب کو جن کا جذباتی لگاؤ ہو وہ بھی اعضا عطیہ کرتے ہیں خصوصاً گردہ کا عطیہ ان دنوں مقبول ہے۔

(4) مبادلہ پذیر جوڑوں کا عطیہ(Paired Exchange):

یہ وہ تکنیک ہے جس میں خواہش مند عطیہ دہندہ اور عطیہ پانے والے میاں بیوی ہیں مگر ان کے نسیجوں میں ہم آہنگی نہیں یا Match نہیں کرتے اور حیاتیاتی مقابلہ میں موافق نہیں تو کسی دوسرے جوڑے کی تلاش کی جاتی ہے جو اسی طرح کے مسئلہ سے دوچار ہوں تب ان نئے

جوڑوں کے درمیان Match ہونے پر پیوندکاری کی جاتی ہے۔ اس قسم کا تجربہ برطانیہ میں کامیاب رہا نیز جون ہاپکن اسپتال میں فروری 2009 میں ایسے بارہ جوڑوں کا اپریشن کامیاب رہا ہے۔

(5) اچھے فیاض (Good Samritan) لوگوں کا عطیہ:

اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو فیاض ہیں اور غریبوں کے مددگار ہیں جو انجان لوگوں کو بھی عطیہ فراہم کرتے ہیں تاکہ ان کے عطیہ سے کسی کی جان بچ سکے۔ کچھ لوگ ضرورت کے علاوہ بھی عطیہ کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

(6) عطیہ بالمعاوضہ (Compensated Donation):

بعض عطیہ دہندہ کو عطیہ کے بدلے رقم بھی فراہم کرائی جاتی ہے جو دنیا کے بعض حصوں میں مروج ہے خواہ قانون اس کی اجازت دے یا نہ دے۔ اسی بنا پر ''طبی سیاحت'' (Medical Tourism) کو وسعت ملی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ غیر قانونی قرار دیا گیا ہے مگر طرفہ یہ ہے کہ عطیہ معاوضہ کو بڑھاوا دینے والے غریب ملکوں سے عطیہ حاصل کرنے والے ترقی یافتہ ملک کے ہی رہنے والے ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایران وہ واحد ملک ہے جو اپنے گردہ کو بیچنے کی اجازت دیتا ہے اور ایک گردہ کی قیمت دو سے چار ہزار ڈالر لگائی جاتی ہے۔

AYN Rand Institute اس نظریے سے متفق ہے اور اس کی وکالت کرتا ہے بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ اگر 6 فی صد امریکن 19 سال سے 65 سال کی عمر کے اگر اپنا گردہ بیچ دیں تو منتظر لوگوں کی فہرست ختم ہو جائے گی۔

ماہر اقتصادیات کا ماننا ہے کہ گردہ کا عطیہ بمقابلہ ''کرائے کی کوکھ'' سے خطرناک نہیں جو قانوناً اکثر ملکوں میں مروج ہے۔

پاکستان کے بعض گاؤں میں تو 40 سے 50 فیصد لوگ ایک ہی گردہ سے کام چلا رہے ہیں۔ چونکہ ہر ایک گردہ امیروں کو بیچ چکے ہیں۔

ڈالر عطیہ دہندہ کو مل جائے مگر بچولے آدھی رقم ہڑپ کر جاتے ہیں اور عطیہ دینے والے کو آدھی ہی رقم مل پاتی ہے۔

سنامی کے بعد چینئی کے ماہی گیروں نے چالیس سے ساٹھ ہزار روپے میں گردے فروخت کیے چونکہ ان کے پاس گزارے اور ماہی گیری پر روک سے مشکلیں پیدا ہوگئی تھیں۔

(7) عطیہ بالطاقت(Forced Donation):

بعض ملکوں میں بزور عطیہ قیدیوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ چین کے نائب وزیر صحت کے بقول تقریباً95 فی صد تمام اعضا پیوند کاری کے لیے سزائے موت کے قیدیوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔

2007 میں عالمی دباؤ کی بنا پر چین اس بات کے لیے رضامند ہوا کہ اسے اب ختم کیا جائے گا لیکن کب؟ یہ ابھی بھی معلوم نہیں۔ چین اس کے لیے راضی ہوا کہ اب صرف عطیہ رشتہ داروں سے قبول کرے گا۔

اعضا کو محفوظ رکھنے کی مدت:

گردہ	72 گھنٹے
جگر	18 گھنٹے
دل	5 گھنٹے
دل جگر	5 گھنٹے
لبلبہ	20 گھنٹے
قرنیہ	10 دن
ہڈی کے گودے	مختلف
جلد	5 سال یا زیادہ بھی
ہڈی	5 سال یا زیادہ بھی
دل کے والو	5 سال یا زیادہ بھی

اس وجہ سے اعضا کے حمل ونقل میں آسانی ہوتی ہے۔

تقریباً نصف صدی قبل اعضا رئیسہ جیسے گردہ، جگر، دل کی ناکردگی سے بے پناہی کا احساس ہوتا تھا اور اکثر حالات میں موت ہوجاتی تھی لیکن دنیائے طب کی ایجادات میں اعضا کی

پیوند کاری نے ایک عجیب انقلاب برپا کردیا۔خصوصاً تین دہائی نے تو کمال ہی کردیا ہے۔ جراحی کی نئی تکنیک، سالمی حیاتیات(Molecular Biology) مناعیات(Immunology) اور پر اثر اور مزاحمتی مناعیت(Immuno Supressives) کی وجہ سے اعضا کی پیوند کاری کے بعد استرداد(Rejection) کم ہونے لگا اور ہزاروں مریضوں کو دوسری زندگی ملنے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں تقریباً 1800 زراعت اعضا کے مراکز قائم ہیں اور کم از کم 750000 مریضوں کو اعضا رئیسہ کے پیوند کاری سے فائدہ ہو چکا ہے۔

1950 میں ڈاکٹر جوزف مَرّے اور ڈاکٹر ڈیوڈ ہیوم نے اعضا رئیسہ کی منتقلی کا کام پہلی بار شروع کیا۔ ان کے مریضوں میں گردہ کے مریض پیوند کاری کے بعد تقریباً 38 سال زندہ رہے، جگر کے 30 سال، ہڈی کے گودوں کے 28 سال، دل کے 25 سال اور گردہ لبلبہ کے ساتھ ساتھ 25 سال، پھیپھڑے کے منتقلی کے بعد ۱۴ سال وغیرہ۔

ایسا نہیں کہ سارے مریضوں کا کامیاب آپریشن ہوتا گیا اور سو فیصد کامیابی ملی بلکہ اعضا کے استرداد(Rejection) کی بھی تعداد بڑھتی گئی۔

دوسری طرف اعضا کے منتقلی کے منتظر مریضوں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے خصوصاً مردوں سے ہدیہ اور منتقلی کافی کم ہوگئی۔

لہٰذا اعضا کی رسد اور طلب میں ایک خاصہ فرق ہے جس کی وجہ سے منتظر مریضوں میں ہر سال ہزاروں کی تعداد فوت کر جاتی ہے۔

اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مارچ 2002 میں 80000 مریض اعضا کے منتظر تھے جبکہ 1977 میں صرف 50000۔

اس وقت طلب اعضا کی فہرست میں ہر پندرہ منٹ پر ایک مریض جڑ جاتا ہے۔ صرف 2000 میں ان منتظر مریضوں میں 6250 فوت ہو گئے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے کئی ادارے مُردوں سے اعضا کے حصول کے لیے نئی پالیسی، نئی اسٹریٹیجی اور ریفارم کی سوچ رہے ہیں۔ کئی ملکوں میں زندہ اشخاص سے لیے گئے اعضا کی پیوند کاری ہو رہی ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

اعضا کی پیوندکاری کے طرف داروں کا ماننا ہے کہ اعضا کی منتقلی سے نہ صرف مریضوں کی زندگی میں اضافہ ہورہا ہے بلکہ ان کی زندگی خوب تر ہوئی ہے اور Productivity میں بھی اضافہ ہوا ہے خصوصاً بچوں اور سماج کے سن رسیدہ لوگوں میں یہ تبدیلی پائی گئی ہے۔

اس کے علاوہ اعضا کی منتقلی سے بہبودی صحت کے اخراجات میں بھی کمی آئی ہے۔ مثال کے طور پر گردہ کی پیوندکاری کے مقابلے اکثر ایک سال، پانچ سال، دس سال ڈائیلیسس ہوتی رہے تو پیوندکاری کے مقابلے 20فی صد سے 40 فیصد زیادہ خرچ بیٹھتا ہے۔

باتیں زندہ لوگوں کے اعضا کی منتقلی کی چل نکلی تھی۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ مردہ انسان جو قدرتی موت سے مرا اس سے عطیہ کیسے حاصل ہوا اور ایسے اشخاص جو دماغی موت سے مرنے والے قرار دیے گئے ان سے کیسے عطیہ وصول کرتے ہیں۔ چونکہ دماغی موت کی پیچیدگیوں کو جان کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موت کی تعریف بدلنے سے کہیں ''دماغی موت بنام پیوندکاری اعضا'' تو نہیں۔

مردہ انسان سے اعضا کا عطیہ:

پوری دنیا میں اعضا کے منتقلی کے مراکز میں اعضا کی فراہمی بہت ہی کم ہے اور منتظرین کی تعداد اس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ باوجودیکہ اعضا کی فراہمی کے لیے مختلف طریقے اپنائے گئے ہیں۔ مرنے والے کے لواحقین کو تلقین کی جاتی ہے۔ عوام میں بھی اس کی چرچا کی جاتی ہے کہ ہر انسان مرنے سے پہلے زندگی کا تحفہ (Gift of Life) دوسروں کو دے کر جائے، پر نتیجہ خاطرخواہ حاصل نہیں ہوتا۔

ان کوششوں میں ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ تمام آبادی کو اعضا کے عطیہ کے لیے ''مفروضہ رضامندی'' (Presumed Consent) مان لی جائے جسے معاشرہ نے اصولی طور پر مان لیا کہ ہر بالغ جب مرتا ہے تو وہ ایک اہل عطیہ کنندہ ہوتا ہے اور زندگی ہی میں اس نے اپنے اغراض ظاہر کردیے ہوں خواہ اہل خانہ راضی ہی کیوں نہ ہوا اعضا لیے جاسکتے ہیں۔ دنیا کے بعض ملکوں میں تجربہ کارگر ثابت ہوا ہے۔ یورپ اور ایشیا کے کئی ملکوں نے اخلاقی اور قانونی لحاظ سے ان اصولوں کو قبول بھی کرلیا ہے جیسے اسپین اور سنگاپور جہاں اعضا کے عطیہ کی شرح 20 فی صد فی ملین ہوگئی جب کہ امریکہ میں یہ تعداد 40 فیصد فی ملین ہے۔

کئی بڑے مذاہب جن میں عیسائی، یہودی اور اسلام نے بھی اپنے رائے مثبت دی ہے۔
مغربی مما لک میں یہ کوشش جاری ہے کہ اصول مفروضہ رضامندی کو قانونی طور پر لاگو کیا جائے تا کہ اعضا کی رسد بڑھ سکے اور مزید ضرورت مندوں کی حاجت پوری ہو سکے۔ بعض ماہرین اخلاقیات اس سے اتفاق نہیں رکھتے۔ چونکہ ان کے خیال میں اگر مرنے والے کو اعتراض ہوگا بھی تو وہ مکتوب نہیں ہوتا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مفروضہ رضامندی ممکن ہے جبر ودباؤ کا باعث نہ بن جائے۔

کئی ترقی پذیر ملکوں میں ان اخلاقی ترک کے علاوہ چند پیچیدگیاں سماجی، ثقافتی اور مذہبی بھی ہیں۔ چونکہ موت کے بعد جسم کا صحیح سالم دفن ہونا زیادہ اہم ہے۔

بعض ملک ایسے بھی ہیں خصوصاً چین جہاں سزائے موت کے قیدی کے موت کے بعد اعضا نکال کر مخصوص مریض، اسپتال، اداروں اور اطبا کو دے دیا جاتا ہے۔

ابھی سویڈن کے اخبار نے تازہ خبر شائع کی ہے جس سے اس بات کا علم ہوا ہے کہ اسرائیلی فوج جب کسی فسلطینی پر حملہ کرتی ہے تو مقتول کے اعضا نکال کر دو دن کے بعد لواحقین کو واپس کرتی ہے اور عمل سرقہ اندازی 2000 سے ہو رہا ہے۔

مردوں سے عطیہ لینے کا ایک اور طریقہ رائج ہو رہا ہے جس میں ایسے اعضا کو بھی اہمیت دی جاتی ہے جو کچھ کم صلاحیت Marginal یا Suboptimal اعضا ہیں۔

عام طور پر امریکہ میں ایسے عطیہ کنندہ رد کر دیے جاتے ہیں یعنی 60 سال سے بیشتر اور 5 سال سے کم عمر والے بچوں کے اعضا نیز ایسے مریض ذیابیطس جن کے گردے کو نکالے ہوئے 40 گھنٹے سے زیادہ ہو گئے ہوں۔

جارج ایم۔ ابونا کا کہنا ہے کہ 1980 میں کویت میں مردہ جسم سے گردہ نکالنا مشکل تھا تو تقریباً 100 ایسے گردے امریکہ سے درآمد کر کے کویتیوں میں منتقل کیے جو کافی حد تک کامیاب رہے اور وہ پہلے سائنس داں تھے جنھوں نے مارجنل گردوں کی پیوندکاری کے بعد رپورٹ شائع کی۔

موت کی تصدیق:

اعضا کے منتقلی کے اوائل دور میں ایسے عطیہ کرنے والوں جن کا حرکت قلب کا ملازرک جانے اور سانس کی آمد و رفت بند ہو جانے پر ان کا دل لے کر پیوند کاری کی جاتی تھی 60 کی دہائی میں دماغی موت کے باوجود قلب میں حرکت اور پھیپھڑوں میں تنفس لائف سپورٹ کے ساتھ ہوتا رہا پھر بھی انھیں مردہ قرار دیا گیا۔

1967 میں ڈاکٹر برنارڈ نے جنوبی افریقہ میں سب سے پہلے ایسے ہی دماغی موت کے مریض کا دل نکال کر دوسرے شخص میں لگا دیا۔ یہ عمل اور اس کے مضمرات نے پوری دنیا کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا۔ تب سے موت کے معیار اور موت کی نئی تعریف پر غور و خوض ہونے لگا اور آج پوری دنیا میں دماغی موت کو موت حقیقی تصور کیا جانے لگا مگر شوشہ یہ لگایا گیا کہ موت کی تصدیق ایسے اطبا کے ذریعہ ہونی چاہیے جنھیں اعضا کے منتقلی اور پیوند کاری سے تعلق نہ ہو۔

آج کے دور میں ہر سوسائٹی اور بیشتر مذاہب بہ شمولیت اسلام نے دماغی موت کو موت مان لیا ہے۔

ooo

اعضا کی منتقلی کے نئے پہلو

(NEW DIMENSION OF ORGAN TRANSPLANT)

موت کی نئی تعریف نے اعضا کی کامیاب زراعت اور پیوندکاری کے نئے راستے کھول دیے۔ ابھی نصف صدی قبل اعضا ان مُردوں سے حاصل کیے جاتے تھے جن کا انتقال فوراً ہی ہوا ہو مگر مشکل یہ پیدا ہوتی تھی کہ ایسے اعضا کی کامیاب پیوندکاری نہیں ہو پاتی تھی کیونکہ اکثر ایسے اعضا موت کے عمل کے دوران ابتر حالت کو پہنچ جاتے تھے۔

1968 میں ہارورڈ میں ایک کمیٹی نے موت کے تعین کے لیے ایک نئے طریقے کی سفارش کی جس کی رو سے دماغ کے تمام افعال وعمل کے خاتمے کو دماغی موت کہا جائے گا اور دراصل یہی موت کہلائے گی۔ چونکہ اس سے قبل حرکت قلبی کے رکنے کو موت کہا جاتا تھا یعنی دماغی موت نے قلبی موت کی جگہ لے لی۔ دماغی موت آج کے دور میں موت کی نشانی مانی جاتی ہے جس میں دماغی موت کے باوجود نبض، بلڈ پریشر اور زندگی کے دوسرے آثار موجود ہوتے ہیں خواہ وہ لائف سپورٹ (Life Support) کے ذریعہ ہی کیوں نہ سانس لے رہا ہو۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ دماغی موت میں عملی طور پر دماغ ناقابل عمل ہو جاتا ہے اور یہی صحیح آثار موت ہے۔ موت کی اس نئی تعریف سے طبی فائدہ یہ ہوا کہ اعضا رئیسہ جیسے قلب، جگر، گردے بہ آسانی فراہم ہونے لگے اور

تازہ دم فعال اعضا کی زراعت کامیاب ہونے لگی۔ چونکہ یہ اعضا فعال تھے اور اسی حالت میں منتقل ہوئے لہٰذا انھیں کامیاب ہونا ہی تھا۔ دماغی موت کے اعضا کا ہدیہ حاصل کر کے اس وقت Ventilator کام کرتا رہتا ہے تا آنکہ اعضا جدانہ کر لیے جائیں۔

ابھی حلقہ اخلاقیات میں دماغی موت کے متعلق بحث چھڑی اور جاری ہی تھی کہ دماغی موت کو موت مان لیا جائے اور اعضا کی پیوندکاری کو جائز قرار دیا جائے کہ اطبا اور ماہرین اخلاقیات نے اعضا کے حصول کی ایک دوسری نئی اسکیم بھی تیار کر لی جس کے تحت وہ مریض جو دماغی موت کے شکار نہیں ہوئے مگر وینٹی لیٹر کی مدد سے زندہ ہیں اور انھیں Hopeless قرار دیا گیا ہے ان کا Ventilator ہٹا کر جلد سے جلد دل نکال لیا جائے اور دماغی موت سے قبل قلبی موت دے دی جائے اور یہی غیر حرکت قلبی عطیہ (Non Heart Beating Organ Donation) یعنی NHBD عطیہ کہلائے گا۔

آج کے دور میں تقریباً نصف تنظیمیں تو اعضا حاصل کر رہی ہیں وہ اس عمل میں ملوث ہیں۔ جبکہ زیادہ تر عوام اس طرح سے حاصل کیے جانے والے اعضا کے متعلق بے خبر ہیں۔

پہلی بار NHBD سے متعلق خبر اپریل 1997 میں میڈیا کے ذریعہ CBS کے توسط سے نشر ہوئی۔ 60 منٹ کے اس پروگرام میں ابتدا ایک کم عمر خاتون کے واقعے سے ہوئی جس کے سر میں گولی لگی تھی اور اسے Hopeless حالت میں مانا جارہا تھا۔ گرچہ وہ دماغی موت کی شکار نہیں ہوئی تھی لیکن شدید زخم نے اسے موت کے قریب پہنچا دیا تھا۔ NHBD کے معیار کے مطابق یہ ایک مناسب اور معقول کیس تھا تاہم لاش کے پس مرگ معائنہ (Autopsy) سے پتہ چلا کہ وہ بچائی جاسکتی ہے۔

ٹیلی ویژن کے اس پروگرام کے میزبان Mike Wallace کو NHBD کی پالیسیوں کے متعلق مختلف سوالات اٹھانے کا موقع مل گیا اور یہ اخذ کیا گیا کہ اعضا کی نکاسی زراعت کے لیے ایسے لوگوں سے حاصل کی جاتی ہے جو بالکل مردہ نہیں۔ "Non Quite Dead"

60 منٹ کے اس پروگرام میں ایک اور بات سامنے آئی کہ NHBD کی پالیسی کے تحت Heparin (خون کو پتلا کرنے والی) اور Regitine (رگوں کو پھیلانے والی) جیسی

خطرناک دوائیں استعمال کی جاتی ہیں تا کہ اعضا کی زراعت سے قبل اعضا کی حفاظت ہو سکے۔

ظاہر ہے ان باتوں کے انکشاف سے احتجاج اور بحث ومباحثے کی راہیں کھل گئیں۔

NHBD کا طریقہ اور اس کے اخلاقی پہلو:

NHBD کے طریقہ کار میں معاملات کو دو قسموں میں بانٹا گیا ہے۔ ایک وہ جو بااختیار (Controlled) اور دوسرا بے اختیار (Uncontrolled) ہو۔

بااختیار میں وینٹی لیٹر ہٹالیا جاتا ہے اور حرکت قلب کے رکنے کا انتظار کیا جاتا ہے تا کہ قلبی موت واقع ہو جائے اور تب اعضا ابتری سے قبل جدا کر لیے جاتے ہیں۔ بے اختیار NHBD کی حالت تب پیدا ہوتی ہے جب مریض کی اچانک موت ہو جاتی ہے اور اسے دوبارہ ہوش میں نہ لایا جا سکے۔ ایسے میں نلکیوں کے ذریعہ جسم میں سرد حفاظتی مائع (Cold Preventive Fluid) داخل کیا جاتا ہے تا کہ اعضا کی پیوندکاری ہو سکے۔ یہ حالت اضطراری ہے لہٰذا ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ لواحقین کو خبر کی جا سکے اور ان سے اجازت حاصل کی جا سکے۔ طریقہ کار گراں ہونے کے سبب مروج نہیں۔ لہٰذا بااختیار یا Controlled NHBD کو ہی سمجھ لیں۔

سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ علاج کو روک لیا جائے اور خون کو پتلا کرنے اور رگوں کو پھیلانے والی دوائیں رگوں کے ذریعہ جسم میں داخل کر دی جائے تا کہ اعضا کو پیوندکاری سے پہلے محفوظ کیا جا سکے۔

گر چہ اعضا کی منتقلی کے ماہرین اس بات سے متفق نہیں کہ یہ دوائیں نقصان دہ ہوتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک زندہ انسان میں اگر غلطی سے بھی یہ دوا داخل کر دی جائے تو موت ہو سکتی ہے اور ایسا کرنا نا قابل معافی جرم ہے۔

طریقہ:

وینٹی لیٹر (Ventilator) ہٹالیا جاتا ہے پھر ڈاکٹر صاحبان یا ماہرین دل کی دھڑکن کے رکنے اور سانس کے رکنے کا انتظار کرتے ہیں۔ بعدازاں مریض کے قلبی موت کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ وینٹی لیٹر ہٹاتے ہی دو سے پانچ منٹ کے اندر موت واقع ہو جاتی ہے پھر فوراً ہی آپریشن روم میں لے جا کر مطلوبہ اعضا نکال لیتے ہیں۔

وینٹی لیٹر (Ventilator) کے ہٹانے کے بعد نہ تو کوئی عمل ایسا کیا جاتا ہے کہ دوبارہ مریض بہتری کی طرف مائل ہو بلکہ CPR یعنی ہوش میں لانے (Cardio Pulmonary Resucitation) والا عمل بھی نہیں کیا جاتا۔ چونکہ مریض کے مقدر کا فیصلہ کرلیا گیا ہے اور یہ تصور کرلیا جاتا ہے کہ دل میں اب دھڑکن شروع نہیں ہوسکتی۔

دماغی موت سے متعلق معلومات کی یہاں ضرورت نہیں چونکہ یہ اختیاری NHBD کے دائرے میں آتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قلب کے رکنے کے بعد دماغی موت بھی واقع ہونی ہی ہے۔ جانوروں پر تجربات کے ساتھ مطالعہ حرکت اور CPR کے تجربات سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے مریض کو کئی کئی منٹ کے بعد بھی ہوش میں لایا جاسکتا ہے۔

ادھر اعضا کی نکاسی کی تیاریاں جاری رہتی ہیں تو دوسری طرف اُس مریض کو بھی ساتھ ساتھ تیار کیا جاتا ہے جس میں یہ اعضا منتقل ہونے ہیں۔

اگر NHBD والے مریض کی سانس نہیں رکتی اور قلب کی دھڑکن جاری رہتی ہے جیسا کہ توقع کی جارہی تھی تو پیوندکاری کے پروگرام کو ملتوی کرنے سے قبل گھنٹہ بھر انتظار کرلیا جاتا ہے اور چونکہ یہ فیصلہ کیا جاچکا ہے کہ علاج روک لیا جائے لہٰذا دوبارہ اسپتال کے کمروں میں بھیج کر اس بات کا انتظار کیا جاتا ہے کہ اُس کی موت واقع ہوجائے۔

NHBD والے عطیہ دہندہ کی خصوصیات:

(1) ایسے مریض جن کی حالت اس قدر ابتر ہوگئی ہے کہ نا قابل برداشت حد تک پہنچ گئی ہے اور وہ اس سے چھٹکارہ پانا چاہتے ہوں۔

(2) وہ مریض جو گرچہ دماغی موت میں مبتلا نہ ہوں لیکن شدید اعصابی مرض میں مبتلا ہوں۔

(3) ایسے مریض جنھیں حادثات میں اس قدر چوٹ پہنچی ہو کہ بچنے کی کوئی صورت نہ ہو یا نباتاتی حالت کو پہنچ گئے ہوں۔

(4) ایسے مریض جو نہ صرف لائف سپورٹ کے ساتھ زندہ ہیں بلکہ ایسے بھی اس

ہمیں دیکھنا ہے کہ اعضا کی منتقلی، زراعت اور پیوند کاری کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان موضوعات پر خصوصاً شرعی اصول و نظریات سے متعلق لٹریچر بہت کم ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر محمد علی البار بابائے اخلاقیات مانے جاتے ہیں جنھوں نے سب سے پہلی بار تفصیلی مقالہ لکھا اور اس کے بعد اسی روشنی میں کچھ اور لوگوں نے اپنی رائے دی۔

بقول ڈاکٹر محمد علی البار دنیائے طب کی جدید پیش رفت نے جو اخلاقی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں وہ ماہرین اخلاقیات طبی فلسفیوں، قانون دانوں، ممبر پارلیمنٹ، مذہبی رہنماؤں نیز ان اطبا کا جو روزمرہ کے مشاغل سے دوچار ہیں ان کا میدان ہے اسلام نہ صرف ایک مذہب ہے بلکہ ایک ضابطہ حیات ہے اور اسلامی اسکالرز بیک وقت ماہر اخلاقیات و فقیہہ ہوتے ہیں۔

طب میں نئے طریقے اور نئی تکنیک کی کوئی نظیر نہیں لہٰذا اسلامی ماہرین قانون کے لیے بعض موضوعات پر فتویٰ دینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ پھر بھی فقہا نے گزشتہ دہائیوں میں مختلف کانفرنسوں میں جس میں ماہرین طب بلائے گئے اور دماغی موت، اعضا کی منتقلی زائدگی، افزائش نسل کے نئے طریقوں، اسقاط حمل اور قتل بجذبہ رحم جیسے موضوعات پر بحث ہوئی ہے۔

قراردادیں پاس ہوئیں جس کی بنا پر طبی اخلاقیات کے تحت قوانین بنائے گئے کیونکہ روز بروز دنیا کے طب میں تیزی سے ترقی ہو رہی ہے۔

اتنے اہم مسائل پر فقیہہ کیسے کسی فیصلہ پر پہنچتے ہیں اور کس طرح فتویٰ دیتے ہیں اسے بھی سمجھ لیں اسلامی اصول قانون دوستوں پر قائم ہے۔

(1) اصول (بنیادی حقائق) (2) فروغ (شاخیں)

فقیہہ قرآن وسنت رسولؐ، احادیث (سنت قولیہ) اور عمل (سنت فعلیہ) اور پھر پسندیدگی (سنت تقریریہ) کے گہرے مطالعے کے بعد ہی اس کی روشنی میں فیصلہ دیتے ہیں۔ اگرچہ فقیہہ کسی فیصلہ پر قرآن وسنت کی روشنی میں بھی نہیں پہنچ پاتا تو اجتہاد اور قیاس کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ دوسرے منبع جیسے المصالح المرسلہ یعنی عوام کے قاعدے کو نظر میں رکھتے ہوئے اور اس بات کا خیال کرتے ہوئے کہ قرآن وسنت سے نہ ٹکرائے فیصلہ دیتا ہے۔ فقیہہ حنفیہ میں اس کے علاوہ استحسان بھی اختیار کیا جاتا ہے یعنی عوام کی بہتری اور مناسب حل کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔

وہ دوسرے منبع جیسے المصالح المرسلہ یعنی عوام کے قاعدے کو نظر میں رکھتے ہوئے اور اس بات کا خیال کرتے ہوئے کہ قرآن وسنت سے نہ ٹکرائے فیصلہ دیتا ہے۔فقیہہ حنفیہ میں اس کے علاوہ استحسان بھی اختیار کیا جاتا ہے یعنی عوام کی بہتری اور مناسب حل کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔

یوں تو اعضا کی منتقلی اس صدی کی انوکھی چیز نہیں بلکہ قدیم ہندو سرجن نے ناک، کان کے عیوب کو دور کرنے کے لیے پیوند خود (Autograft) کا طریقہ اپنایا تھا۔

سسثر تاسنہتا ایک قدیم ہندستانی سرجن (700 سال قبل مسیح) نے پیوند کے اصول بتائے تھے پھر مسلمان جراحوں نے اس میں کچھ ترمیم کی پھر اطالوی سرجن Tagliacozz اور برطانی سرجن نے اسے اور آگے بڑھایا۔

یہی نہیں روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے قتادہ ابن نعمان کی آنکھ دوبارہ چسپاں کی تھی۔معاوض بن عرفہ کا بازو نیز جب ابن یاسف جو جنگ احد و جنگ بدر میں جدا ہو گیا تھا دوبارہ لگایا گیا۔

مسلم فقہا نے دانت اور ہڈیوں کی منتقلی کی اجازت دی ہے جسے زمانۂ اوائل کے مختار مسلم جراحوں نے اپنایا۔امام نووی (1277-1233) نے اپنی ضخیم کتاب المجموع اور شرح منہاج الطابین میں اس موضوع پر بحث کی ہے پھر الامام اشربینی نے اپنی کتاب مغنی المحتاج میں اس پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

دوسرے کئی فقہا نے 14-12 صدی عیسوی میں پیوند خود (Autograft)، پیوند گر (Allograft) اور پیوند حیوان (Xenograft) کی اجازت دی ہے۔

اعضا کی منتقلی کے اسلامی اصول وقوانین:

علاج کے سلسلے میں بنیادی اسلامی اصول اور قوانین بالکل سیدھے ہیں جس کے تحت انسانی قدر و قیمت اور بقائے زندگی وصحت نیز انسانی اخوت ورحم دلی اہم جز ہیں۔

اسلام کی نظر میں بیماری ایک قدرتی حالت ہے اور گناہوں کا کفارہ ہے جو اسے برداشت کرتے ہیں انھیں دنیا اور آخرت دونوں میں انعام ملتا ہے۔تاہم انسان کو چاہیے کہ علاج کی جستجو کرے اور کرائے۔

نبی کریمؐ نے فرمایا: اے اللہ کے بندو علاج تلاش کرو۔ جس نے بیماری پیدا کی ہے اس نے شفا بھی فراہم کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہر بیماری کا علاج ہے خواہ موجودہ وقت میں ہم اس سے واقف نہ ہوں۔

مسلمانوں کو نئے طریقہ علاج کے تجسس کی ترغیب کی گئی ہے۔ اعضا کی منتقلی ایک نیا طریقہ علاج ہے اور بڑا ہی کارگر ہے لہٰذا اسے اپنانا چاہیے۔

سب سے پہلے خون کی منتقلی کا مسئلہ کھڑا ہوا تھا مگر اس وقت کے فقہا نے گرچہ خون کو نجس قرار دیا گیا ہے اجازت دی۔ مسلم فقہا نے اس نجس کی منتقلی کی اجازت دی چونکہ حصول صحت کے لیے اسے اشد ضروری مانا گیا ہے۔

کئی فقہا نے خنزیر اور دوسرے جانوروں کی ہڈیوں کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے جو ظاہر ہے ایک نجس جانور ہے۔

زکریا القزوینی 1283-1203 جو عراق کے مفتی اعظم تھے جنھوں نے اس بات کو سمجھا کہ ہڈیوں کے منتقلی میں خنزیر کی ہڈی عمل و کارکردگی میں بہتر ہے۔ لہٰذا اجازت دی۔

اعضا کی منتقلی میں چند باتیں ضرور پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اس نئے طریقہ علاج سے جسم انسانی کو نقصان نہ پہنچے، دوسروں کے مقابلے کم تر نقصان ہو، وصول کنندہ کے علم میں ساری باتیں آنی چاہیے اور اس کی رضامندی ضروری ہے۔

انسانی قدر و قیمت:

انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ جیسا کہ کلام پاک میں اللہ نے فرمایا:

"إِنِّيْ جَاعِلٌ فِيْ الْأَرْضِ خَلِيْفَةً ."

(''میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں'')(سورۃ البقرہ، آیت:30)

اور فرمایا:

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا."

لہٰذا انسان کو اپنے وقار کا خیال ہر حال میں رکھنا چاہیے خواہ وہ بیماریوں اور آلام ہی میں مبتلا کیوں نہ ہو۔ انسانی جسم خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ اس کا احترام مقدم ہے۔

''آنحضرت ﷺ نے قبرستان میں ایک آدمی کو جس نے کسی مردہ کی ہڈی توڑ دی تو ڈانٹا اور فرمایا کسی مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی زندہ کی ہڈی توڑنا۔ خاطر خواہ احترام ہر مردہ کو دینا چاہیے جیسا کہ اسوہ رسول رہا ہے۔ رسول اکرم ﷺ ایک بار گزرتے ہوئے یہودی کے جنازے کو دیکھ کر احترام میں کھڑے ہو گئے جبکہ یہودی ان کے سخت دشمن تھے۔ اصحاب میں سے کسی نے تعجب کا اظہار کیا اور کہا یا رسول اللہؐ یہ جنازہ یہودی کا تھا تو فرمایا یا رسول اللہؐ نے کیا وہ روح انسانی نہیں تھا؟''

تمام انسان برابر ہیں۔ ان کی نیت اور اعمال کا یوم قیامت اللہ کے یہاں فیصلہ ہوگا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا عرب عجم سے بہتر نہیں سفید پوست کو سیاہ پوست پر فوقیت نہیں سوائے تقویٰ اور نیک اعمال جیسا کہ خداوند قدوس نے فرمایا:

"يَـا أَيُّهَـا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَـائِـلَ لِتَـعَـارَفُـوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ."

(''اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور اس لیے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو تمھارے کنبے اور قبیلے بنا دیے ہیں، اللہ کے نزدیک تم سب میں باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ یقین مانو کہ اللہ دانا اور باخبر ہے۔'') (سورۃ الحجرات:13)

مصلہ یعنی قطع بُرید اعضا ناپسندیدہ اور ممنوع عمل ہے تاہم پوسٹ مارٹم، یا قطع برائے علم تشریح یا عطیہ کرنا اعضا کا مصلہ کے زمرے میں نہیں آتا۔ مصلہ نفرت، حقارت اور انتقام کے بدلے میں آتا ہے۔ علم کے لیے جسم کا یا اعضا کا کاٹنا اور معائنہ جائزہ ہے۔

ابن الرشید (بارھویں صدی) نے کہا کہ علم تشریح کا علم حاصل کرنے والا خدائے بزرگ و برتر کی بزرگی کا قائل ہو جاتا ہے اور بہت شکر گزار ہوتا ہے۔

امام شافعی (آٹھویں صدی) نے فرمایا۔علم کی دو بڑی شاخیں ہیں ایک جو مذہب سے متعلق ہو اور دوسری جسم انسانی سے۔ اس طرح اعضا کا عطیہ مصلہ نہیں ہوتا۔ یہ عمل خیرات و حسنات کا ہے چونکہ کوئی اپنے اعضا دوسروں کی زندگی بچانے کے لیے پیش کر رہا ہے اور کلام الٰہی میں واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو بغیر اس کے
کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد مچانے والا ہو، قتل کر ڈالے تو گویا
اس نے تمام کو زندہ کر دیا۔''

اگر کسی کے اعضا کو جدا کیا گیا ہے تو اس سے ہونے والے خیر کا موازنہ کیا جانا چاہیے چونکہ یہ کسی کی زندگی کے لیے عطیہ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ واضح رہنا چاہیے کہ اعضا کی زراعت بغیر عطیہ کنندہ کی رضامندی کے جائز نہیں۔ اگر لاوارث لاش ہو تو کسی مسلم قاضی کا فتویٰ لازم ہے۔

عطیہ کنندہ اگر زندہ ہے تو اپنے اعضا رئیسہ میں سے کسی عضو کو عطیہ نہیں کر سکتا۔ اگر اس سے اس کی موت واقع ہو جائے چونکہ یہ خودکشی مانا جائے گا جو اسلام میں نہایت ناپسندیدہ گناہ ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے جُرم ہے۔

اس بات کا خیال رہنا چاہیے کہ جسم انسانی اللہ کی ملکیت ہے جیسا کہ کائنات کی اور چیزوں کا مالک اللہ ہے۔ انسان کو اس کا جسم اور دولت اللہ نے عطا کیا ہے جسے اللہ اور رسول کے بنائے اصول کے مطابق استعمال کرنا چاہیے۔ اور علماء کے نزدیک اعضا کا عطیہ کار خیر اور خیرات ہے جس سے کسی انسان کو بچایا جا سکتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ یہ بھی جاننا چاہیے کہ جسم انسانی کی تجارت نہ ہو، اسی وجہ سے عطیہ رشتہ داروں کے لیے مختص ہوتا ہے۔

اعضا کی پیوندکاری کے سلسلے میں اسلامی فتاوے مختلف دور میں آتے رہے ہیں اور ہنوز سلسلہ جاری ہے۔ اس کی ابتدا شیخ حسن مامون مفتی اعظم مصر نے 1959 میں آنکھوں کی قرینہ کی زراعت کے سلسلے میں فتویٰ سے کی۔ 1966 میں ان کے بعد قاضی شیخ حریدی نے دوسرے اعضا کے سلسلے میں فتویٰ دیا اور عصرِ شیخ خاطر نے نامعلوم جلد کے لیے 1973 میں اجازت دی اور تب شیخ جادالحق نے مردوں سے اعضا کی زراعت کی اجازت چند شرائط کے ساتھ دی ہیں۔

(1) فوت ہوئے انسان کی وصیت یا اجازت ہو

(2) رشتہ داروں کی اجازت ہو

(3) نامعلوم لاش سے اعضا کی پیوند کاری کے لیے مجسٹریٹ سے اجازت ہو

زندہ انسان سے حاصل کیے جانے والے عطیات اعضا کے شرائط ہیں:

(1) بالغ انسان کی اجازت

(2) جسم کو کوئی نقصان نہ پہنچے یا نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو

(3) کسی کی زندگی بچانے کی خاطر یہ ضرورت پیش آرہی ہو

(4) تحفۃً دیا جارہا ہو۔

بہتیرے مسلم ممالک نے اس سلسلے کے فتوے دیے جن میں ملیشیا، الجزائر کویت نیز اسلامک فقہ کانفرنس شامل ہیں۔

OOO

قتل بہ جذبۂ رحم

(EUTHANESIA)

ایوتھنیزیا (Euthanesia) ایک یونانی اصطلاح ہے جس کے مختلف معنی لیے گئے ہیں۔ EU کے معنی ہیں ''اچھا'' اور Thanos یعنی ''موت''۔ ایوتھنیزیا یعنی ''اچھی موت'' جسے ماہرین ''بلا تکلیف موت'' گردانتے ہیں۔ اکثر ایوتھنیزیا کا ذکر آتے ہی سننے والا بڑی آسانی سے کہنے لگتا ہے اچھا اچھا "Mercy Killing" جسے قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے سیدھے ترجمہ کرکے ''قتل بہ جذبۂ رحم'' کی اصطلاح دے دی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس کے معنی اور مطالب میں کافی فرق ہے۔

جیسا کہ ایوتھنیزیا کے لغوی معنی ''اچھی موت'' لی جائے یا ''موت بلا تکلیف'' لی جائے تو ہم سب کہیں گے کہ بھلا اچھی موت کون نہیں چاہے گا۔ ایسی موت جو سکرات سے پہلے اور گھٹ گھٹ کر تڑپنے سے پہلے آجائے۔ ضعف و ناتوانائی، بے یاری و مددگاری، ہر نفس اس بات کا خواہشمند ہوگا کہ اسے چلتا پھرتا اٹھالیا جائے اور کسی کی محتاجی نصیب نہ ہو۔ ایوتھنیزیا کے ایک اور معنی یہ بتائے جاتے ہیں کہ ''کسی دوسرے کے ذریعہ قصداً زندگی کو ختم کرنے کے لیے مرنے والے کی صریحاً گزارش۔'' یعنی کسی دوسرے کی مدد سے خودکشی۔ لہٰذا یہاں بھی معنی و مطالب کے

لحاظ سے مختلف شاخیں نکل پڑیں اور نتیجتاً اخلاقی، مذہبی اور سماجی سوال کھڑے ہوئے اور پیچیدگیاں بھی شروع ہوگئیں اور مفہوم نے معنی کو خلط ملط کر دیا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس مبہم اصطلاح کے فرق کو سمجھیں۔

عام طور پر وہ عمل جو قریب المرگ بیماریوں کی اذیت کو برداشت نہ کرنے والے اشخاص کے لیے قبل از وقت موت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خصوصی طور پر وہ لوگ جو کوما، دماغی موت یا نباتاتی حالت میں پہنچ گئے ہیں اور طبعی حالات میں لوٹنے کی کوئی امید نہیں ہو ان کے تعلق سے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ اسے موضوع ہی کیوں بنایا جائے۔

میں نے قبل اس طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ الحمدللہ برصغیر میں اب تک یہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ اور موضوع بحث ترقی یافتہ ملکوں کا ہے۔ مگر خدشہ اس کا ہے کہ مغربی فکر یہاں بھی نہ پیدا ہو جائے۔ گاہے بہ گاہے اخباروں میں اور ٹیلی ویژن کے توسط سے خواہش کی جاتی ہے اور حکومت سے اپنے عزیزوں کے لیے جو بیماری و آزاری، ضعف و ناتوانائی اور برداشت کی طاقت کھو رہے ہوتے ہیں استدعا کرتے ہیں کہ زندگی کو ختم کرنے کی اجازت مل جائے۔ مگر یہ تعداد نا کے برابر ہے۔ بوڑھے اور ناتواں اشخاص ہمارے سماج اور سوسائٹی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارے گھروں کے تانے بانے بکھرنے کے باوجود ان کا وجود مقدس ہے اور طمانیت قلبی عطا کرتا ہے۔ ہمارا سماج اپنے بزرگوں اور عزیزوں کی تیمارداری میں اور علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔

ایوتھنیز یا کی قسمیں:

عام طور پر اسے دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ پہلا فعالی (Active) اور دوسرا انفعالی (Passive)۔

فعالی (Active):

وہ قسم ہے جس میں کوئی ایسا عمل کیا جائے کہ موت کے خواہشمند کو جو ابتر حالت میں پہنچ گیا ہو یا نقاہت اور تکلیف برداشت سے باہر ہو اور درد نا قابل برداشت ہو انجکشن یا دوسرے عمل سے ابدی نیند سلا دیا جائے یعنی موت دے دی جائے۔ دراصل یہی مرسی کلنگ یا قتل بہ جذبۂ رحم کہا جاتا ہے۔ اس میں مہلک انجکشن کا استعمال ہوتا ہے۔ دراصل یہی قسم موضوع بحث و احتجاج ہے۔

انفعالی(Passive):

وہ قسم ہے جس میں موت کے خواہاں فرد کو جو لائف سپورٹ (Life Support) کی مدد سے زندہ رکھا گیا ہے اسے ہٹا لیا جائے اور اس فرد کو بچانے کی کوئی تدبیر نہ کی جائے۔ لائف سپورٹ کے حدود میں Ventilator یا Respirator ہی نہیں بلکہ کھانا پینا، دوائیں، طبی اور جراحی عمل بھی آتا ہے اور اسے روک لینے کو انفعالی ایوتھنیزیا کہا جاتا ہے۔ اگر بفرض محال قلب اور پھیپھڑے کی کارکردگی کے لیے CPR کی ضرورت بھی پڑے تو نہ دیا جائے تاکہ مریض جس مرض میں مبتلا ہے شدت مرض سے مر جائے۔ یہ عمل مریض کے ذریعہ خود بھی ہوسکتا ہے اور معالج یا اس کے عملے کے تعاون سے بھی ہوسکتا ہے۔

دیگر قسموں میں----

رضاکارانہ (Voluntary) ایوتھنیزیا:

اگر مریض خود خواہش ظاہر کرے اور منظوری دی جائے۔

غیر رضاکارانہ (Non-Voluntary) ایوتھنیزیا:

اگر مریض منظوری نہ دے اور اسے موت دے دی جائے۔

نادانستہ (Involuntary) ایوتھنیزیا:

اگر مریض مزید زندہ رہنے کا خواہش مند ہو پھر بھی اسے مار دیا جائے۔

انفعالی ایوتھنیزیا میں عام علاج کو روک دیا جاتا ہے جیسے اینٹی بائیوٹک، علاج برائے سرطان یا کسی آپریشن کا فیصلہ یا درد والم کے لیے لے رہے مورفین کو روک لیا جائے یہ سوچتے ہوئے کہ اس سے موت واقع ہو جائے گی۔ اس قسم کا ایوتھنیزیا عام ہے اور مختلف اسپتالوں میں مروج ہے۔

ایک اور اصطلاح بہت عام ہے جسے اعانتی خودکشی (Assisted Suicide) کہتے ہیں جو ایوتھنیزیا کے زمرے میں آتی ہے۔ چونکہ خواہش مند مریض کو اپنی جان لینے میں کسی کی مدد حاصل ہو جاتی ہے خواہ وہ مشین ہو، دوا ہو یا کوئی اور عمل ہو۔ یہ اعانت یا امداد رشتہ داروں، طبیب یا طبیب کے عملے کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ کچھ ماہرین قانون کے مطابق طبیب کے تعاون سے خودکشی، خودکشی نہیں کہلاتی۔

دیگر اصطلاح "Coup De Grace" یعنی "Death Blow" جو دوست یا دشمن کی تکلیف کو ختم کرنے کے سلسلے میں استعمال ہوتی ہے۔

رضا کارانہ طور پر کھانے اور پینے سے انکار کو بھی ایوتھنیز یا کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ بھوک ہڑتال میں ہوتا ہے اور اسے انفعالی ایوتھنیز یا کے دائرے میں لیا جاتا ہے۔

تاریخ قدیم:

جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ ایوتھنیز یا ایک یونانی اصطلاح ہے جسے ماہرین موت بلا تکلیف گردانتے ہیں۔ تاریخ طب کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سقراط نے 400 سے 300 قبل مسیح ایک عہد نامہ تیار کیا تھا جو اب تک رائج ہے جس میں کسی کو خوش کرنے کے لیے کسی مہلک دوا تجویز نہ کرنے کی قسم کھائی گئی ہے۔

"To please No onc Will I Prescribe A Deadly Drug Nor Give Advice Which May Cause His Heath."

اس کے باوجود قدیم یونانی اور رومی اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے کہ زندگی کی محافظت اتنی اہم ہو سکتی ہے اور اسے کسی قیمت پر گنوانا نہیں چاہیے۔ مرتے ہوئے انسان کی خودکشی معیوب سمجھی جاتی تھی۔

تاریخ جدید:

انیسویں صدی سے ایوتھنیز یا کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً شمالی امریکہ اور یورپ میں بحث و مباحثہ کا دور شروع ہوا۔ طبی تاریخ داں Ezekiel Emanuel کے قول کے مطابق شعبہ بیہوشی کی یافت کے بعد ایوتھنیز یا کے جدید دور کا آغاز ہوا۔

1828 میں پہلا امریکی قانون نیویارک میں پاس ہوا اور مختلف ریاستوں میں اس کے خلاف احتجاج اور ہنگامہ آرائی شروع ہوئی لیکن خانہ جنگی کے بعد رضا کارانہ ایوتھنیز یا کو وکلا اور کچھ اطبا کی طرف سے تقویت پہنچی۔ ڈاکٹروں کی مدد سے ایوتھنیز یا سوئٹزرلینڈ میں قانونی بن گیا۔

اسی زمانے میں امریکی عدالت کے پاس ایسے بہتیرے مسائل آئے جو اطبا کی مدد سے ایوتھنیز یا چاہتے تھے اور اس کا نام مرسی کلنگ پڑ گیا۔ ان معاملات میں زیادہ تر والدین تھے جن کے بچے شدید طور پر معذور تھے۔

نازی جرمنی۔ جنگ عظیم دوئم سے قبل اور دوران نازی جرمنی نے ایوتھنیز یا پروگرام اکتوبر 1939 میں چلایا جس کا کوڈ تھا "AKTION T4"۔

ابتدا میں ہٹلر نے مرسی کلنگ برائے معذورین و بیماران شروع کی۔ مقصد تھا کہ ایسے لوگوں کو جو سماج کے لیے بے سود ہیں انھیں ختم کر دیا جائے۔ شروع شروع میں نومولود اور نوخیز بچوں کے لیے قانون بنا جو ذہنی یا دماغی معذور اور جسمانی معذور و دیگر نقص والے تھے۔

تین ڈاکٹروں کی ٹیم ہوتی تھی جو محض کچھ سوالات کی بنیاد پر بغیر معائنہ اور مطالعہ کے حکم صادر کرتے تھے۔ ہر اہلکار (+) سرخ رنگ سے اور (—) بلو رنگ سے بنا دیتا تھا۔ سرخ + کا مطلب (ہاں) قتل کا حکم اور بلو کا مطلب (نا)۔ مقتول کو بچوں کے مخصوص شعبوں میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں انجکشن سے یا رفتہ رفتہ بھوکے رکھ کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا۔

رفتہ رفتہ یہ قانون بڑے بچوں اور بالغین کے لیے بنا جسے نامزد اطبا معائنہ کے بعد نا قابل علاج لوگوں کے لیے مرسی کلنگ کا حکم دیتے۔

پھر سوال نامہ پاگلوں کے اسپتال، دوسرے اسپتال اور ایسے ادارے جہاں قدیم مریضوں کا علاج ہوتا تھا بھیجا گیا اور پراگندہ ذہنی، مرگی، پیرسالی، آتشک، ذہنی خبط، ورم دماغ و دیگر اعصابی مرض میں مبتلا مریضوں نیز پاگل، غیر جرمن، یہودی، نگرو و جاپانیز کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا اور مرسی کلنگ کے نام پر خاتمہ ہوتا رہا۔ کل چھ ایسے مراکز تھے۔

Branden Burg میں ایک قدیم جیل خانے کو مرکز قتل بنایا گیا جہاں نازی گیس چیمبر کا تجربہ کیا گیا۔ یہ چیمبر حمام کے جھرنوں کی مانند تھا۔

اس چیمبر میں ایک نلی باہر سے آتی تھی جس کے ذریعہ کاربن مونو آکسائیڈ پہنچائی جاتی تھی۔ مریض کو چیمبر میں داخل کرنے کے قبل بیہوشی کی دوائیں کھلا کر اور ننگا اس چیمبر میں داخل کیا جاتا۔ چیمبر سے متصل بھٹی ہوتی جہاں نعش سوزی ہوتی اور خانوادوں کو موت کا سبب سکتہ قلبی یا نمونیہ بتا دیا جاتا تھا۔

تاریخ بعد از جنگِ عظیم:

آسٹریلیا میں 1995 میں دنیا کا سب سے پہلا ایوتھنیزیا کا قانون "حقوق مریضان قُربُ الموت 1995" بنا اور اس کے تحت صرف چار مریض ہی فائدہ اٹھا پائے تھے کہ 1997 میں اس قانون پر روک لگ گئی اور Dr. Philip Nitschre کے بنائے مشن پر سوالات اٹھنے لگے۔

یورپ میں 1997 میں برطانیہ کے ایک معاملہ میں ڈاکٹر جان بوڈکن اڈمس (Dr. John Bodkin Adams) نے تکلیف سے نجات دلانے میں مریض کو مہلک انجکشن دیا تھا جسے کچہری نے قتل نہیں مانا۔ 1993 میں نیدرلینڈ میں بھی ڈاکٹروں کی مدد سے خودکشی کو جُرم قرار نہیں دیا گیا پھر بلجیم سے بھی خبریں آنے لگیں۔ وہاں کے مشہور مصنف Hugo Claus کو جوالزھیمر میں مبتلا تھا مارچ 2008 میں ایوتھنیزیا کی سہولت مہیا کی گئی۔

امریکہ میں 1997 میں کیلیفورنیا نے زندہ وصیت کو قانوناً قبول کرلیا۔ اس سے قبل 1994 میں Oregon کے رائے دہندگان نے Death with Dignity Act کو پاس کیا تھا جس کی رو سے جاں بہ لب مریضوں کو ڈاکٹروں کی مدد سے موت کے لیے اجازت دے دی گئی تھی۔

ابھی چند سال قبل Terri Schiavo Case میں جو 1990 سے 2005 تک نباتاتی حالت میں تھی اور محض غذا کی نلکی کے ذریعہ اسے غذا پہنچائی جاتی تھی، کورٹ کی مداخلت کے بعد نلکی نکالنی پڑی اور پندرہ سال اس حالت میں زندہ رہنے کے بعد اس کی موت ہوئی جس سے بحث کا ایک دور پھر شروع ہوگیا۔

2008 میں واشنگٹن میں Washington-1000 Initiative نام کا قانون بنا جو دوسری امریکی ریاست ہے جس نے اطبا کی مدد سے خودکشی کو اجازت دی ہے۔

چین و ہانگ کانگ:

فعال ایوتھنیزیا چین میں گرچہ غیر قانونی ہے مگر رجحان بدل رہا ہے۔ ہانگ کانگ میں ایوتھنیزیا کے لیے عوام میں مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ خصوصاً جو مذہبی رجحان نہیں رکھتے اور غیر مسیحی ہیں مالی حالت بھی بہتر ہے اور جو بہت ضعیف ہیں۔

رضا کارانہ ایوتھنیز یا کے مخالفین اور موافقین کے درمیان بحث:

موافقت والوں کی دلیل ہے کہ۔

- آزادی کے اس دور میں پسند اور ناپسند بنیادی اصول ہے اور اپنے سلسلہ میں فیصلہ اس کا حق ہے۔
- ایک انسان جب بیمار ہوتا ہے تو درد والم سے گزرتا ہے اور بسا اوقات دوائیں بھی اس کے لیے تکلیف کو دور نہیں کرتی ہیں۔ نہ صرف جسمانی تکلیف بلکہ اپنی زندگی سے بیزار لاچارگی کی تکلیف کا احساس بے انتہا ہوتا ہے۔
- آج کے دور میں اسپتالوں میں جگہ کی کمی، ڈاکٹروں پر حد سے زیادہ بار رکھتے ہوئے ان مریضوں پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے جو بچائے جاسکتے ہیں اور ان کے مقابلے میں ایسے افراد جو خود سے مرنا چاہتے ہیں ان کو سہولت ملنی چاہیے۔ اگر اس پر توجہ دی گئی تو اسپتالوں اور ڈاکٹروں پر بار کم ہوگا مریض کی صحیح دیکھ ریکھ ہو سکے گی۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو جن کا سماج میں کوئی کام نہیں رہا انھیں رکھے رہنا سودمند نہ ہوگا اور وسائل کو قابل علاج مریضوں پر صرف کیا جاسکے گا۔

مخالفت میں بولنے والوں کی دلیل ہے کہ۔

- صحت عامہ سے متعلق خصوصاً اطبا کی رضا کارانہ ایوتھنیز یا سے مصالحت غیر ذمہ دارانہ حرکت مانی جائے گی اور سقراط کے عہدنامے کی پامالی ہوگی۔
- مذہبی ذہنیت رکھنے والوں نے اسے بالکل ناقابل قبول تصور کیا ہے اور اس عمل کو قتل کے مترادف سمجھا ہے۔ رضا کارانہ ایوتھنیز یا خودکشی گردانی جائے گی۔
- اگر ذرا بھی مرض سے نجات ملنے کی امید ہو تو کوشش اس بات کی ہونی چاہیے اور توجہ بحالی صحت کی ہونی چاہیے۔
- بفرض محال اگر ایسا ہوتا ہے تو مریض کے ہوش وحواس رہتے اس کی وجوہات اور امکانات اور دوسرے متبادل اور نتیجے پر غور کرنا چاہیے۔
- رضا کارانہ ایوتھنیز یا کے سلسلے میں مالی مشکلات کی وجہ سے بھی نفسیاتی دباؤ پڑسکتا ہے۔ ایوتھنیز یا اور مذہب۔

بودھ مذہب:

بودھ مذہب کے ماننے والوں کے درمیان بھی ایوتھنیز یا کے متعلق کوئی متفقہ رائے نہیں۔
اگر کوئی بھکچھو راہب یا راہبہ نے کسی کو مرنے میں مدد کی خواہ وہ زبان سے یا عمل سے مدد کی ہو تو وہ بھکچھو جماعت (سنگھ) سے خارج ہو جائے گا۔

دلائی لاما نے 1996 میں فرانسیسی پریس کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ بودھ دھرم کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر ذی نفس کی زندگی بیش قیمت ہے اور ظاہر ہے ان میں انسان سب سے پہلے ہے۔ ہم صحیح سمجھتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ ایوتھنیز یا سے اجتناب کیا جائے۔ بودھوں کا طریقہ ہے کہ صحیح و غلط اور فوائد ونقصانات پر غور کرنا ہے۔ انھوں نے کوما میں پڑے انسان کا ذکر کیا جس کے بارے میں یقین ہو چکا ہے کہ موت ہونی ہے یا ایک ایسی حاملہ جس کی زندگی خطرے میں پڑ چکی ہے لہٰذا اس میں بھی فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔

بودھوں کے نقطہ نظر کے مطابق ہر معاملہ مختلف ہے اور ہر کا فیصلہ معاملے پر غور و فکر کے بعد ہونا چاہیے۔

عیسائی مذہب:

کیتھولک ایوتھنیز یا کو سرے سے خارج کرتے ہیں اور وہ اسے ''زیست کے خلاف جرم'' (Crime Against Life) مانتے ہیں۔ چونکہ ان کی نظر میں انسانی زندگی کا احترام، انسانی وقار، انسانی حقوق، موت کو برحق ماننا اور خیرات جیسے اصول عام ہیں۔

رضا کارانہ یا غیر رضا کارانہ ایوتھنیز یا اور موت بلا امداد طبی کو غلط مانا جاتا ہے نیز غیر مناسب اور غیر متوازن سمجھا جاتا ہے۔ یہ گروہ ڈاکٹروں سے توقع رکھتا ہے کہ فنی مہارت، حتی المقدور توجہ جذبہ رحم اور قلبی تسکین مہیا کریں۔

ویٹیکن (Vatican) زندگی وحیات کے خلاف کس طرح کا جرم جن میں قتل، نسل کشی، اسقاط حمل قتل بہ جذبۂ رحم اور اپنی پسند سے خودکشی کا مخالف ہے۔

پروٹسٹنٹ گروہ ایوتھنیز یا اور اطبا کی مدد سے موت پر مختلف نظریے رکھتے ہیں۔

جین مذہب:

مہاویر، بانی جین مذہب بڑی وضاحت اور صراحت سے کسی شروک (جین مذہب کے ماننے والے) کو اپنی زندگی خود یا وصیت کرنے کو جو قریب المرگ ہے اجازت دیتے ہیں۔ اور عقیدہ یہ ہے کہ انھیں مکچھا اسی طرح مل سکتی ہے۔ زندگی کے دور سے آزادی مذہب کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔

یہودی مذہب:

یہودیوں میں بھی طبی اخلاق کے سلسلے میں مختلف نظریات اور مختلف رائے ہے۔ عام طور پر ایوتھنیزیا کے مخالف ہیں اور کبھی شدت سے اسے رد کیا جاتا ہے لیکن بعض گروہ ان میں رضا کارانہ انفعالی ایوتھنیزیا کو غلط نہیں مانتے بلکہ مخصوص حالات میں اس کی موافقت میں پائے جاتے ہیں۔

شینٹو مذہب:

جاپان میں جہاں شینٹو مذہب کی اکثریت ہے 69 فی صد تنظیمیں رضا کارانہ انفعالی ایوتھنیزیا کے موافقت میں ہیں۔ گھروں میں 75 فی صد لوگ اس موت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ شینٹو مصنوعی مشینوں کی مدد سے زندہ رہنے کو نہایت شرمناک مانتے ہیں۔ فعلی ایوتھنیزیا کے متعلق 25 فیصد شینٹو اور بودھ موافقت میں ہیں۔ Kamikaze وہیں کی ایجاد ہے۔

سمورائی:

سمورائی رسوم کے مطابق جسے SEPPUKU کہتے ہیں وہ بھی ایوتھنیزیا کی ایک قسم ہے۔ مرنے والا اپنے کو خود سے خنجر مارتا جاتا ہے تا کہ جلد سے جلد موت آجائے اور کوئی مددگار اس عمل میں اس کا ہاتھ سر قلم کر کے دیتا ہے جسے رضا کارانہ ایوتھنیزیا یا قتل بہ جذبۂ رحم کہا جاتا ہے اور بودھ مذہب کی طرح سے پوکو کی رسم خودکشی کے وقت ذہنی طور پر پرسکون رہتا ہے۔

ہندو مذہب:

ہندو دھرم میں ایوتھنیزیا اور اطبا کی مدد سے خودکشی کے متعلق نظریات مختلف ہیں لیکن ہر حال میں بنیاد ایک ہی ہے۔ یعنی کرم، پونر جنم اور اہنسا۔

ہندوؤں میں گزشتہ صدی تک ''ستی'' عام رسم تھی جو سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی ہیں خودسوزی۔ بیوہ اپنے شوہر کی چتا پر بیٹھ کر جل جاتی تھی اور یہ روایت مہابھارت کی تحریروں میں ملتی ہے اور اس زمانے کی کئی رانیوں نے ستی کی رسم پوری کی تھی۔ دور جدید کے ہندوؤں کا نظریہ خودکشی اور ایوتھنیز یا مختلف ہے مگر بنیادیں وہی ہیں۔

کرم۔ اس دنیا میں کوئی شخص جیسا عمل کرے گا خواہ وہ اچھا ہو یا برا، اس کا پھل دوسری زندگی میں ملے گا۔ اگر عمل برا رہا تو مکھچا نہیں ملے گی یعنی آواگمن کے چکر یعنی جنم اور پنر جنم کے دائرے سے نجات نہیں ملے گی۔ ہندو مذہب کے ماننے والوں کا مطمع نظر اس دائرے سے نکلنا ہے۔ اہنسا ہندو مذہب کا بنیادی اصول ہے اور دوسرے کو تکلیف پہنچانا ممنوع ہے۔ خودکشی ہندو دھرم میں ممنوع ہے۔ چونکہ اس سے موت وحیات کی گردش متاثر ہوتی ہے۔ ان کے یہاں بھی زندگی ایک قیمتی موقع ہے اور اس موقع کو گنوانا نہیں چاہیے تاکہ نیک عمل سے درجات بلند کیے جاسکیں۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق خودکشی کرنے والا شخص نہ تو دوزخ میں جاتا ہے اور نہ ہی جنت میں بلکہ نتیجتاً وہ اسی دنیا میں بری روح کی شکل میں مارا مارا پھرتا ہے تاکہ اس کا وقت پورا ہوجائے۔ اس کے بعد وہ جہنم میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں سخت سزائیں ملتی ہیں۔ آخر میں پھر وہ زمین پر بھیجا جاتا ہے تاکہ اپنے پرانے کرم کو پھر سے شروع کر سکے۔

اسلام مذہب:

خودکشی اور ایوتھنیز یا دونوں ہی طبی اخلاقیات کی رو سے نزاع کا موضوع ہے۔ اسلام میں سارے مسائل کے حل کے لیے شرعی اصول ہیں جو قرآن وسنت فتاوے اور اجماع پر منحصر ہیں۔ آخری حل اجتہاد کے ذریعہ نکلتا ہے لہٰذا خودکشی اور ایوتھنیز یا کے مسائل بھی شرعی دائرے میں آتے ہیں۔

مومن کا ایمان خدائے واحد پر ہے اور اس کے ننانوے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ''الخالق'' ہے یعنی اللہ کی ذات باصفات خالق ہے اور تمام بنی نوع انسان مخلوق ہیں۔ اسی کے حکم سے ہم پیدا ہوئے اور اسی کی مرضی سے اٹھائے جائیں گے۔ مومن کے لیے یہ دنیا دائمی نہیں بلکہ فانی ہے اور ساری کاوشیں آخرت کے لیے ہی ہوتی ہیں۔

اسلام میں خودکشی حرام ہے اور ہر مسلمان اس بات سے واقف ہے کہ خودکشی کی سزا دائمی جہنم ہے لیکن ایوتھنیزیا کا مسئلہ کچھ زیادہ پیچیدہ ہے۔

گرچہ ایوتھنیزیا کسی کی مدد سے غیر قانونی ہے مگر نا قابل برداشت درد، بیماری کی انتہا کو پہنچنے پر اور اس کی تکلیف کی تاب نہ رکھنے اور مشین کے سہارے زندہ رکھے جانے کی حالت میں مریض یا اس کے قانونی وارث کو اطبا کی صلاح پر مشین ہٹا لینے کی اجازت بعض علماء دیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ مشین ایک قسم کا علاج ہے جبکہ اسلام میں علاج کی تلقین کی جاتی ہے لیکن ذمہ داری نہیں۔ مشین کو ہٹانا کسی کو قصداً ختم کرنے کے مترادف نہیں تاہم فیصلہ میں گنجائش ہے۔

زندگی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے، ایک تحفہ ہے اور زندہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فعال جسم عطا کیا ہے۔ دیکھنے کو آنکھیں، سننے کو کان، چلنے کو پیر اور سوچنے کے لیے دماغ اور بے شمار نعمتیں فراہم کی ہیں اور یہ تحفہ فضول نہیں دیا گیا۔ انسان اسے آزادی اور اپنی مرضی سے استعمال بھی کرتا ہے مگر ایک مومن ہر عمل میں اللہ کے بتائے اصول کے مطابق ایک مدت معینہ تک استعمال کرتا بھی ہے۔ اس مدت کی حد قادر مطلق ہی جانتا ہے جو موت وحیات کا مالک ہے۔

گرچہ مصیبتیں اور پریشانیاں بھی اللہ کی ہی عطا کردہ ہیں جسے ایک مومن امتحان خداوندی سمجھتا ہے اور اچھا یا برا جو بھی کسی کے ساتھ ہوتا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے اور اس استقامت کا اجر وانعام اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا جہاں اسے دائماً رہنا ہے۔

اگر کوئی خودکشی کرتا ہے تو اس کا ایمان متزلزل ہو چکا ہوتا ہے اور اللہ کی مرضی کے خلاف وہ یہ عمل کرتا ہے۔ ایوتھنیزیا اور مرسی کلنگ بھی اسی وجہ سے اسلام میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اللہ اور صرف اللہ ہی کو حق ہے کہ موت وحیات کا فیصلہ کرے۔ وہ بڑا ہی مہربان اور کرم کرنے والا ہے۔ اللہ کے علم میں درد والم ہے اور وہ بخوبی واقف ہے۔ فرماتا ہے:

''وَلاَ تَقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيماً۔''

(''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے۔'')

(سورۃ النساء، آیت: 29)

OOO

مرسی کلنگ اور دور جدید
(MERCY KILLING AND MODERN ERA)

ہمیں دیکھنا ہے کہ دور جدید میں ایوتھنیز یا کے متعلق کیا رویہ ہے اور اچانک آئینی حقوق کی طلب کیوں ہو رہی ہے، سائنسی ترقی ہمیں کہاں لیے جا رہی ہے اور پھر اسلام کا کیا نقطۂ نظر ہے۔

فعالی (Active) اور انفعالی (Passive) ایوتھنیز یا سے دو باتیں اخذ ہوئیں جن میں پہلی یہ ہے کہ ناگفتہ بہ حال کو پہنچنے پر مریض کو اس کی خواہش اور طلب کو دیکھتے ہوئے اسے زہریلی دواؤں، گیس یا کسی اور طریقہ سے موت کی نیند سلا دیا جائے تا کہ وہ دردوالم سے نجات پا جائے۔ دراصل یہی فعالی ایوتھنیز یا ہے جسے ہمارا کھلا ذہن مرسی کلنگ (Mercy Killing) یعنی قتل بہ جذبۂ رحم کہتا اور سمجھتا ہے۔ قتل بہرحال قتل ہوتا ہے وہ رحم کے جذبہ سے ہو یا انتقام کے جذبہ سے۔

دوسری قسم انفعالی ہے یعنی ایک مریض نباتاتی حالت (Vegetative State) میں پہنچ گیا ہے، وہ مردہ بہ دست زندہ جیسا ہے۔ اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ اب وہ اپنی طبعی حالت کو نہیں لوٹ سکتا۔ مزید یہ کہ تیمارداری پر کثیر اخراجات صرف ہو رہے ہیں اور

تیمارداروں پر اس کی زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ ایسے میں لائف سپورٹ کے ذریعہ اسے زندہ رکھا گیا ہے، اسے ہٹا لیا جائے تو وہ خود بخود فوت ہو جائے گا۔ دیگر طبی مسائل کی طرح مرسی کلنگ بھی مباحثہ اور نزاع کا معاملہ مانا جاتا ہے خواہ وہ سائنسی، مذہبی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔

اگر ہم مذہبی یا شرعی احکام کو پرے رکھیں تو بھی ذہن میں مختلف سوالات ابھرتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کوئی مریض بے حد تکلیف میں ہے اور اسے اسپتال لے جایا جاتا ہے تو وہ کیا احساسات ہیں جو لائف سپورٹ دینے کو اکساتے ہیں اور پل بھر میں اسے لائف سپورٹ مل جاتی ہے اور وہ گویا نئی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ جواب تو یہی ہوگا کہ لائف سپورٹ اس لیے دی جاتی ہے چونکہ یہ ذمہ داری ہے اور ڈیوٹی ہے کہ کسی زندہ کی جان خواہ جس حال میں ہو بچالی جائے چونکہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔

اور پھر کون سی چیز ہے جو لائف سپورٹ ہٹا لینے سے روک لیتی ہے ایسے وقت بھی ڈیوٹی اور فرض ہوتا ہے کہ اسے جاری رکھا جائے تاکہ اس کی قدرتی موت نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے اگر ہٹا لیا جائے گا تو اس کی موت ہو جائے گی اور اسے قتل مانا جائے گا۔

جو لوگ قتل بہ جذبۂ رحم کی بات کرتے ہیں اور اس کے طرفدار ہیں وہ یہ دلیلیں پیش کرتے ہیں کہ مریض کو جسمانی ایذا سے نجات مل جائے گی۔ اگر قانونی طور پر مان بھی لیا جائے تو نفسیاتی ایذا سے بھی بچانے کے لیے یہی عمل ہونا چاہیے۔ اگر کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی کسی جذباتی صدمہ کا شکار ہو یا کوئی کاروباری خسارہ سے دوچار ہوا ہو اور قلاش ہو گیا ہو یا اسی طرح کے دوسرے حالات پیدا ہوئے ہوں تو ایسے میں بھی موت بہتر ہوگی۔ آخر حد کہاں مقرر ہوگی؟

بہت سے لوگ قریب المرگ لوگوں کا حق سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی موت کا فیصلہ خود کریں مگر جب یہ حق مروت یا احسان مندی میں بدل جائے اور اس کا بے جا استعمال ہونے لگے تو یہی نہیں بلکہ بے صبر وارثین کے لیے آسان ہتھکنڈا ہو جائے گا۔ بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ شدید علالت اور ضعف میں مبتلا انسان ڈاکٹر کو یہ حکم دے سکے کہ اس کا علاج روک دیا جائے یا جاری رکھا جائے۔ اگر ڈاکٹر مریض کی مرضی سے اس کا علاج کرے اور ضرورت پڑنے پر اس کے حکم سے

بعض ادویات کے سہارے جان لے لے تو کیا ڈاکٹر کو قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔ اگر ایسا ہو تو ''حق موت (Death Right)'' کا قانون بھی بننا چاہیے۔

قریب المرگ انسان کے علاج کے سلسلے میں دو مختلف معاملے خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ بغیر لائف سپورٹ کے انتہائی حالت کو پہنچے مریض کو مرنے دینے کا حق ہونا چاہیے اور دوسرا یہ کہ کسی بھی انسان کو اپنی موت جلد سے جلد حاصل کرنے کا حق ہونا چاہیے اور اس کے لیے ڈاکٹر یا نرس کی مدد لی جا سکتی ہے۔

ایسے میں مرنے والے کی نیت اور حق موت یا مرنے میں تعاون جیسے قانون فعالی ایوتھنیز یا (Active) کی راہیں کھول سکتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ درد والم سے دوچار مریض جس نے موت طلب کی ہو اگر اسے ممکن دوائیں مل جائیں اور اس کا درد تھم جائے تو بہت کم ایسے مریض بچے ہیں جو واقعی موت چاہتے ہوں۔

ہالینڈ (Holland) جو دنیا کا بے حد ترقی یافتہ اور مہذب ملک مانا جاتا ہے وہاں ایوتھنیز یا کی قانونی اجازت ہے پھر بھی رضا کارانہ (Voluntary) سے غیر رضا کارانہ (Involuntary) ایوتھنیز یا کا خطرہ بنا رہتا ہے۔

کچھ سال قبل کے ایک واقعے سے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے قانون پامال ہوتے ہیں۔ Dutch حکومت نے 1990 میں یہ پایا کہ 1030 اشخاص کو بغیر رضا مندی کے موت دے دی گئی اور 22500 ایسے مریض تھے جن کا لائف سپورٹ ہٹا لیا گیا اور ان کی موت ہو گئی جن میں تقریباً 63 فیصد مریض ایسے تھے جنھیں بغیر مرضی کے طبی علاج سے روک لیا گیا جس میں 12 فیصد ایسے تھے جو ذہنی طور پر باہوش وحواس تھے لیکن ان سے پوچھا نہیں گیا۔

بفرض محال اگر مرسی کلنگ کا قانون بن بھی جائے تو کیا گارنٹی ہے کہ اس کا بے جا استعمال نہ ہوگا۔ مثلاً اگر ایک وارث یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کے رشتہ دار جو ثروت مند ہیں اور بیمار ہیں کیا اس کی کوشش نہیں کر سکتا کہ بیماری سے اور تکلیف سے نجات پانے کے لیے مہلک انجکشن لے لینے پر مجبور کرے یا اگر وہ تیار نہ ہو تو انسے اس حالت کو پہنچا دے کہ سوائے موت کی طلب کے کوئی راستہ نہ بچے۔

رضا کارانہ ایوتھنیز یا کے لیے قانوناً اجازت مل جاتی ہے تو پھر ذہنی مریض، معذور اور بوڑھے اشخاص پر تو اور بھی دباؤ بننے لگے گا۔

علاج و تیمارداری کے اخراجات کی بات بھی اٹھے گی اور یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ بوڑھے اور ناکارہ لوگوں پر آخر کیوں اتنا صرفہ ہو اور یہی مغرب میں ہو بھی رہا ہے کہ سن رسیدہ اشخاص اس فکر میں مبتلا ہیں کہ اپنی اولاد پر بوجھ نہ بنیں۔

ایوتھنیز یا کی اجازت کے قانون بننے سے اسپتالوں یا گھروں میں پڑے سن رسیدہ بجائے صحت یابی کی امید کے ڈاکٹر اور نرسز کو شک کی نظر سے دیکھنے لگیں گے کہ نہ معلوم اس بھری سرنج میں یا لٹکتی بوتل میں یا گولیوں میں نہ جانے کیا ہو۔

یہ چند ایسے سوالات ہیں جو ہر ذی شعور کے ذہن میں گھومتے رہیں گے۔

مرسی کلنگ کے طرفداران نہایت رحم دلی سے تکلیف و مصیبت میں مبتلا انسان کو ختم کر کے اسے مصیبت سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور مرنے والا بھی رحم دلانا انجام کر پہنچ جاتا ہے مگر مرسی کلنگ اور مرسی فل دتھ میں بہت فرق ہے جسے غیر منطقی خودکشی اور رضاکارانہ حصول موت دونوں میں فرق ہے۔ مرسی کلنگ اور مرسی فل ڈتھ میں چار نمایاں فرق ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ:

- آیا متوقع موت نقصان دہ ہے یا فائدہ مند
- آیا متوقع موت غیر منطقی ہے یا منطقی ہے۔
- آیا متوقع موت متلون مزاج (ہردم بدلنے والا) شخص کی ہے یا اچھی طرح منصوبہ بند شخص کی ہے۔
- آیا متوقع موت افسوسناک ہے یا قابل تحسین ہے۔

ان دونوں کے مابین فرق کو عملی طور پر بھی جدا کرنا ہوگا نیز لوگوں کا خیال ہے کہ مرسی کلنگ کو ایک جرم سمجھنا ہوگا اور مرسی فل ڈتھ کی اجازت دینی ہوگی۔

14 / جون 2005 کے ہندستانی اخبارات میں حکومت ہند پر بھی دباؤ کا ذکر ہوا تھا اور ایوتھنیز یا کی اجازت سے متعلق خبر بھی شائع ہوئی تھی لیکن اسے قانونی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔

ہم جانتے ہیں کہ رضا کارانہ ایوتھنیز یا اسے کہا جاتا ہے جب ایک انسان خود کے لیے موت کا طلب گار ہوتا ہے۔ دوسری طرف غیر رضا کارانہ ایوتھنیز یا وہ ہے جہاں نہ تو موت کی استدعا ہوا اور نہ ہی اس کی مرضی کا اس میں دخل ہو۔

تاریخ گواہ ہے اور اڈولف ہٹلر کی بربریت تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں کہ غیر رضا کارانہ ایوتھنیز یا کا کیا انجام ہوا۔ قانون کیسے بنا اور کیسے پامال ہوا اور نتیجے میں صرف ایک عامر حاکم نے نیگرو اور یہودیوں کا قتل عام کرایا۔ کیسے ایک انسان نے لاکھوں لوگوں کو مرسی کلنگ کے نام پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سچ تو یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے شخص کی زندگی لینے کا ہرگز حق نہیں۔

کمزور وناتواں، بے کس و بے بس، ضعف ونقاہت، درد والم میں مبتلا انسان کی دلجوئی، نگہداری اور تیمارداری کی جائے اور قدرت نے جو عمر اسے لکھی ہے اسے پورا کر لینے دینا چاہیے۔

ہم خوش قسمت ہیں کہ ایسی دوائیں موجود ہیں جس سے درد میں سکون مل سکتا ہے۔ طبی امداد بھی موجود ہے۔ پوری دنیا ایک گلوبل ویلیج میں بدل چکی ہے، مختلف ٹکنالوجی دستیاب ہیں۔ ایسے میں مریضوں کو کیوں ایوتھنیز یا کی خندق میں دھکیل دیا جائے۔ ہم ایسا کیوں نہیں سوچتے کہ ہمارا دن بھی آئے گا اور ہماری جانیں ابھی دوسروں کے ہاتھوں میں ہوں گی۔

ایسا نہیں ہے کہ سارے ترقی یافتہ ممالک میں یہ زور پکڑ رہا ہو۔ ممکن ہے خوشی سے یہ کام بھی ہو رہا ہو لیکن چار ملکوں میں وقتاً فوقتاً بحث چھڑ جاتی ہے اور حکومت پر دباؤ بڑھ جاتا ہے کہ ایوتھنیز یا کی اجازت باضابطہ قانونی طور پر مل جائے جس میں سب سے زیادہ آگے آسٹریلیا ہے۔ اس کی 81 فیصد آبادی ایوتھنیز یا کے موافقت میں ہے۔ شمالی امریکہ میں Oregon میں تو باضابطہ 1998 میں بل بھی پاس ہوا اور وہاں یہ جائز قرار دیا گیا۔ تیسرا ملک Netherland (Dutch) ہے۔ برطانیہ میں بھی بار بار تحریک چلتی ہے مگر وہاں ابھی قانونی حیثیت نہیں ہے۔

زیادہ تر لوگ ایوتھنیز یا کی موافقت میں اس لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے کیوں نہ باوقار (Dignity) طریقہ سے موت کو گلے لگایا جائے اور اپنے جگر گوشوں کے لیے بوجھ نہ بنیں۔ مشرقی ملکوں میں خصوصاً ہندوستان میں بوڑھے اور پرانے لوگوں کی قدر

ہماری تہذیب کا اثاثہ ہے جبکہ مغرب کی تہذیب وتمدن میں بوڑھوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ بچے جب جسمانی، جذباتی اور مالی اسباب سے انھیں بوجھ سمجھنے لگتے ہیں تو بوڑھے تیمار خانوں یا بوڑھوں کے گھر کا رخ اختیار کرتے ہیں لیکن ہندستانی تہذیب میں بوڑھے اور ناتواں والدین کا سایہ شفقت اور عاطفت نعمت ہے اور اب بھی ان کا وجود گھر کے لیے برکت وعظمت کا باعث ہے اور بعض گھروں میں ان کا اثر ورسوخ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

بوڑھے والدین جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہی ہیں ساتھ ساتھ دماغی اور سماجی طور پر بھی حساس اور احساس کمتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ جب یہ خیال آجائے کہ وہ مالی طور پر بوجھ ہیں۔ ڈاکٹروں کے یہاں بلا مدد جانا، تیمارداری کی ضرورت انھیں ہردم سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور احساس دلاتی ہے کہ وہ بوجھ بنتے جارہے ہیں۔

مرسی کلنگ (Mercy Killing) کے ساتھ ایک دوسری اصطلاح اعانتی خودکشی (Assisted Suicide) بھی چل پڑی ہے۔ بہتیرے معاملات سامنے آئے ہیں جہاں طبیب یا تیمارخانوں کے معاونین یا کارندوں نے خوراک سے زیادہ یا ضرورت سے زیادہ مقدار میں مریضوں کو دوائیں دیں جس کی وجہ سے موت واقع ہوتی ہے۔ نادانستہ طور پر غلطی سے اگر یہ دوا زیادہ مقدار میں دی گئی تو یہ ایک بات ہوئی لیکن دانستہ طور پر زیادہ خوراک میں دوا دینا مختلف عمل ہے جسے فعالی ایوتھنیز یا کہا جائے گا اور اگر غیر رضا کارانہ طور پر دیا گیا تو یہ قتل کہلائے گا جبکہ اعانتی خودکشی تیمارخانوں میں ممنوع قرار دی گئی ہے۔

ایوتھنیز یا کا نام آتے ہی Dr. Jack Kevorkian کا نام بھی سب سے پہلے آتا ہے۔ ستر سالہ ریٹائرڈ پیتھولوجسٹ نے جو امریکہ کے شہر Pontiac کا رہنے والا تھا 1990 میں اپنی گرفتاری تک کم از کم 130 لوگوں کو خودکشی میں مدد پہنچائی اور اس کا نام Dr. Death پڑ گیا اور اسے اس جرم کے لئے 25 سال قید ہوئی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ پوٹاشیم کلورائیڈ زیادہ مقدار میں دے کر مریضوں کو مارتا تھا۔ ہماری سوسائٹی میں کسی کو دوائیں دے کر سلا دینا قتل کا مترادف ہوگا۔ حتیٰ کہ جہاں اعانتی خودکشی کا قانون ہے وہاں بھی بغیر مرضی کے زیادہ خوراک دینا بھی قتل مانا جاتا ہے۔

Dr. Kevorkian (عرفی نام ڈاکٹر ڈتھ) کے بعد 2002 میں نیدر لینڈ نے ایوتھنیزیا کی قانونی طور پر اجازت دے دی اور شاید یہ دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے قانونی حیثیت دے دی اور ڈاکٹروں کو مرسی کلنگ کی اجازت مل گئی۔ کہنے کو تین شرائط رکھی گئیں کہ مریض لاعلاج ہو، ہوش وحواس میں ہو اور مرسی کلنگ کے لیے آمادہ ہو اور اس کی تکلیف حد سے بڑھ چکی ہو۔ اعانتی یا امدادی خودکشی کے سلسلے میں ڈاکٹر کو اپنے ہم منصب سے مشورہ کرنا ہوگا اور ہر مرسی کلنگ کی اطلاع ایک کمیٹی کو دینی ہوگی جس میں ماہرین قانون اور ماہر اخلاقیات اور ڈاکٹر ہوں گے جو معاملے کو پہلے سمجھ لیں گے۔

دراصل یہ سارا معاملہ تب اٹھا جب 1999 میں پتہ چلا کہ 2216 مریضوں کو جن میں بیشتر (99 فیصد) سرطان میں مبتلا تھے امدادی خودکشی کرائی گئی یعنی ڈاکٹروں نے دوائیں مہیا تو کردیں لیکن خود سے انھیں داخل نہیں کیا۔ اس کے بعد کیلیفورنیا سے بھی خبریں آنے لگیں کہ Erfen Saldivar نام کا ایک تنفسی معالج 1989 سے 1997 تک تقریباً چھ لوگوں کو موت دے چکا ہے اور خود کو موت کا فرشتہ (Angel of Death) کہتا ہے۔

اس کے بعد باری آسٹریلیا کی ہے وہاں بھی Dr. Philip Nitschre ڈاکٹر ڈتھ کی شکل میں نمودار ہوئے۔ یہ تو کچھ اور آگے نکلے اور انھوں نے Melbourne میں باضابطہ کلینک ہی اس کام کے لیے کھول لی اور یہی نہیں Sydney اور Brisbane میں بھی شاخیں کھول لیں۔ حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اس کام کے لیے فیس نہیں لیتا تھا بلکہ چندوں سے کلینک چلاتا تھا۔ اس نے 19 لوگوں کو موت دینا قبول کیا تھا۔ اس نے ایک مشین بھی تیار کی تھی جو کمپیوٹر سے منسلک تھی اور مریض کمپیوٹر کے سوالات کا جواب دیتے دیتے آخری ''ہاں'' پر بٹن دباتے فوت ہو جاتا تھا۔ قانون کی دھجی اس نے یہ کہہ کر اڑائی کہ میں ایک جہاز پر یہ سہولیات مہیا کروں گا جو بین الاقوامی سمندر میں ہوگا اور وہاں کسی کا زور نہیں چل پائے گا۔

آسٹریلیا میں Bob Dent نام کا ایک مریض جو پروسٹیٹ کے سرطان میں مبتلا تھا اور قریب المرگ تھا جو شاید دنیا کا پہلا انسان تھا جسے کمپیوٹر کے ذریعہ مہلک انجکشن دے کر موت دی گئی۔

رضا کارانہ ایوتھنیز یا کے مراحل جو کمپیوٹر کے ذریعہ عمل پذیر ہوتے ہیں انھیں بھی جان لیں کیونکہ یہی طریقہ جدید رائج ہوا ہے۔

(1) مرض میں مبتلا مریض کی ماہر کے ذریعہ جانچ، تشخیص اور پیشن گوئی۔

(2) ماہر نفسیات کو کسی قسم کے نفسیاتی مرض کی غیر موجودگی کا یقین دلانا۔

(3) نو دن کا وقفہ تا کہ خوب سوچنے سمجھنے کا موقع ملے۔

(4) مریض کی رگ میں سوئی ڈال دی جاتی ہے تا کہ کمپیوٹر کے ذریعہ دوا داخل کی جاسکے۔

(5) کمپیوٹر میں ایک پروگرام ہوتا ہے جو مختلف سوال کرتا ہے اور مریض کو پوری جانکاری ملتی جاتی ہے۔

(6) ہر مرحلے میں ''ہاں'' اور ''نا'' کی ضرورت ہوتی ہے جسے مریض کو کمپیوٹر پر دینا ہوتا ہے۔

(7) سوالات کے پورا ہونے کے بعد خواب آور دوا کا انجکشن کمپیوٹر کی مدد سے چلا جاتا ہے۔

(8) اعصاب اور عضلات کو ڈھیلے کرنے والی دوائیں بھی پہنچ جاتی ہیں اور اس طرح حرکت قلب رک جاتی ہے اور موت ہو جاتی ہے۔

ایوتھنیز یا کے مروج طریقوں میں عام طور پر استعمال ہونے والی دواؤں میں خواب آور (Narcotics) مسکن (Sedatives) اور ضد مسکن (Antidepressant) ہوا کرتی ہیں۔ یہ دوائیں درد و الم بے کیفی و بے چینی میں استعمال ہوتی ہیں لیکن اگر کوئی تکلیف میں نہ ہو اور نہ کوئی آثار ہوں ایسے میں اگر ضرورت سے زیادہ خوراک دے دی جائے تو موت واقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ ان دواؤں کی کثرت سے سانس لینے کی طاقت کم ہو جاتی ہے اور سانس رک بھی سکتی ہے۔

مارفین (Morphine) جو جوہر افیون ہوتا ہے درد کو کم کرنے کے لیے اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ خاص کر سرطان کے مریضوں میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے مضر اثرات سے فائدہ اٹھا کر مریضوں کو کوما میں بھی بھیجا جا سکتا ہے اور ایسے مریض گفت و شنید کی حالت میں بھی نہیں ہوتے لہٰذا اس کے استعمال اور خوراک کے سلسلہ میں استفسار خانوادہ پر آتی ہے۔ اس کے مضر اثرات کا علم گھر والوں کو ہونا چاہیے۔

آرکائیوز آف انٹرنل میڈیسن جلد 160 شمارہ ایک جنوری 2000 کے ایک مقالہ میں "Attitude and Practices Concerning the end of Life" پر حاصل بحث کی گئی ہے اور نتیجہ اخذ کیا گیا کہ:

(1) جب درد شدید تھا تو 97 فیصد اطبا نے مارفین کی خوراک میں زیادتی کی سفارش کی، 53 فیصد اطبا کی مدد سے Physician Assisted Suicide (PAS) اور 24 فیصد نے ایوتھنیزیا کو ہی تجویز کیا۔

(2) جب شدید نقاہت تھی اور مریض نہایت ضعف کا شکار تھا 36 فیصد نے مارفین کی خوراک بڑھانے، 37 فیصد نے PAS اور 14 فیصد نے ایوتھنیزیا کی رائے دی۔

(3) جب مریض کو شدید احساس ہونے لگا کہ وہ خانوادہ پر بوجھ بن رہا ہے تو 24 فیصد اطبا نے مارفین کی خوراک زیادہ کرنے کی تجویز کی، 24 فیصد نے PAS اور 7 فیصد نے ایوتھنیزیا کی سفارش کی۔

اسی طرح ایک اور تحقیق بنام Euthanasia Movement Grows جو میڈیسن ڈائجسٹ 27 میں شائع ہوئی، اس میں یہ بات قبول کی گئی ہے کہ امریکہ اور آسٹریلیا میں باضابطہ مہم جوئی ہو رہی ہے جس کے نتیجہ میں امریکہ کے Oregon میں PAS کو نومبر 1994 میں قانونی حیثیت حاصل ہوئی۔ تقریباً 4000 ڈاکٹروں کی رائے شماری سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ 60 فیصد اطبا PAS کے حق میں تھے مگر 43 فیصد اس میں ملوث ہونا چاہتے تھے۔ 17 فیصد تو ایسے تھے جو واقعی طے نہیں کر پائے کہ آخر یہ عمل کون کرے۔ اسی طرح Michigan میں جہاں کوئی قانون نہیں پھر بھی 56 فیصد اطبا موافقت میں تھے اور 37 فیصد مخالف تھے اور اگر عوام کا تجزیہ کریں تو 66 فیصد موافقت میں اور 26 فیصد مخالفت میں تھے۔

اسی طرح آسٹریلیا کے شمالی سرحد پر مئی 1995 میں ایکٹ تو پاس ہوا مگر طریقۂ کار کے طے نہ ہونے پر اب بھی اسے قانونی حیثیت نہیں مل پائی ہے۔ نیدرلینڈ اور ڈچ میں ضرور اسے قانونی حیثیت ملی ہے۔

ایوتھنیز یا کے متعلق اسلامی یا شرعی نقطہ نظر:

اس سلسلے میں قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ جو دور جدید کے فقیہہ مانے جاتے تھے ان کے قول کا حوالہ دینا چاہوں گا جنھوں نے ایوتھنیز یا پر ہندستانی علما کی رائے حاصل کی اور اسے دستاویزی شکل بھی دی ہے۔ فرماتے ہیں ''مغربی تہذیب اور یورپ کے اخلاقی بحران نے جو مسائل کھڑے کیے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ نا قابل علاج مریض جس کے اس مرض سے شفایاب ہونے کی آئندہ کوئی توقع نہیں اگر سخت تکلیف کا شکار ہے، اپنے تیمارداروں کے لیے مصیبت ہے، تو کیوں نہیں اس کو اس تکلیف دہ زندگی سے نجات دلا دی جائے۔ چاہے کوئی دوا کھلا کر یا اس کا علاج ترک کر کے۔''

مغربی ملکوں اور مغرب کے زیر اثر ملکوں میں یہ تحریک بڑھتی جا رہی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ جو دین کی روح سے نا آشنا ہے، اس ذہن سے متاثر نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ خودکشی ہے یا قتل۔ اور یہ دونوں ہی حرام ہیں۔ یہ زندگی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ انسان اس کا مالک نہیں ہے۔ اس لیے اسے خود کو مار لینے کی اجازت نہیں اور نہ کسی اور کو حق ہے کہ وہ دوسروں کو ناحق قتل کرے۔ رہا مسئلہ تکلیف اور اذیت کا تو ہر تکلیف و اذیت پر صبر اور اسے اللہ کی رضا کے لیے جھیل جانا ایمان کا تقاضہ اور آخرت میں نجات اور سعادت کا ذریعہ ہے۔ دوسری طرف اسلام صلۂ رحم کو واجب قرار دیتا ہے۔ عیادت اور تیمارداری ایک بھائی کا دوسرے بھائی پر حق ہے۔ ماں باپ کا بڑھاپا اولاد کے لیے جنت کی ضمانت ہے۔ اس لیے اپنے کسی مریض رشتہ دار ہی نہیں بلکہ کسی بھی مریض انسان کی خدمت اور تیمارداری آخرت کی نجات کا ذریعہ ہے۔ پس مریض کو مرض کی اذیت ہو یا مرض کی تیمارداری میں اٹھائی جانے والی تکلیف، دونوں ہی نعمت ہیں، رحمت ہیں، سعادت و نجات کا ذریعہ ہیں۔ مومن کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔ لیکن اس ساری صورتحال کا تعلق آخرت کے عقیدہ سے ہے، جن کو آخرت پر یقین ہی نہ ہو، جو اس زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہوں، جن کے لیے یہاں کی راحت ہی راحت ہے اور یہاں کی تکلیف ہی تکلیف ہے، وہ تکلیف کیوں اٹھائیں۔ وہاں تو بستی کی بستی اجاڑ دی

جا سکتی ہے کہ زندگی اور گراں بار ہوگئی ہے۔ بوڑھے ماں باپ اولاد کو دیکھنے کے لیے ترس جاتے ہیں۔انھیں بوڑھوں کے گھر(Old Age Home) میں رہنا پڑتا ہے۔

جہاں تک Physician Asessted Suicide (PAS) کا تعلق ہے تو علما کرام کی واضح رائے ہے کہ ڈاکٹروں کا مریض کو موت تک پہنچانے کے لیے مثبت عمل کرنا یعنی مہلک دوا دینا یا تدبیر کرنا جس سے عادتاً موت واقع ہو جاتی ہے، شریعت اسلام کی رو سے قطعاً حرام ہے کیونکہ جب تک انسان میں جان رہتی ہے، وہ نفس محترم ہے، اور کسی بھی نفس محترم کو ہلاک کرنے کا ذریعہ بننا نہ صرف یہ کہ ''لا تقتلو النفس التی حرم اللّٰہ ''نص قرآنی سے حرام ہے بلکہ ایسا کرنے والا بعض شکلوں میں خون بہا اور بعض میں قصاص کا مستوجب شرعاً ہوگا۔

البتہ وہ آلہ ہٹا لینا یا دوا نہ دینا یقینی ذریعہ ہلاکت نہیں اگر اس طریقہ سے مریض کی موت ہو جاتی ہے تو یہ عمل ''اہلاک'' نہیں کہلائے گا بلکہ اسے علاج و معالجہ کا ترک کہنا صحیح ہوگا، جو اصلاً حرام نہیں ہے۔ اسلامی اصول و عقائد کے مطابق تمام ذی روح کی حیات و موت کا ایک دن معین ہے۔قرآن کہتا ہے''ولکم فی الارض مستقرٌ و متاع الی حین ''دوسری جگہ قرآن نے کہا ہے''اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعه یستقدمون۔''جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں ایک معینہ مدت تک رہنا ہے اور جب اس کی موت کا وقت آئے گا تو بلا کسی تقدیم و تاخیر کے وہ اس دنیا سے کوچ کر کے رہے گا پھر کوئی طاقت اسے اس دھرتی پر زندہ رہنے کا حق نہیں دے سکتی۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کا حکم ہے''کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے کو معرض ہلاکت میں ڈالے اور دیدۂ دانستہ کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو اس کی ہلاکت و بربادی کا سبب بن جائے''اسی طرح دوسروں کو ناحق قتل کرنا بھی شرعاً ممنوع ہے۔

و لا یقتلون النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق یزنون.

(اور کسی ایسے شخص کو جسے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا ہو وہ بجز حق کے قتل نہیں کرتے) (سورۃ الفرقان، آیت:68)

○○○

آنر کلنگ

(HONOUR KILLING)

قتل بہر حال ایک جرم ہے خواہ وہ کسی جذبے سے کیا گیا ہو۔اس سے پہلے کہ قتل کی تفصیلات پر جائیں اس وقت ایک ایسے قتل کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ہمارے سماج میں گاہے بہ گاہے سننے میں آتا ہے اور موضوع گفتگو بن جاتا ہے۔ جی! میری مراد قتل بہ جذبۂ وقار یعنی Honour Killing سے ہے۔اس سے قبل باوقار موت یعنی Honourable Death کا ذکر ہوا جو ضعیف و ناتواں، بوڑھے اور کمزور، بے کس و بے سہارا لوگ چاہتے ہیں۔ چونکہ انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ اب ان کا زندہ رہنا خود ان کے لیے اور اعزا و اقربا کے لیے بوجھ بن چکا ہے لہٰذا وہ موت کے طلبگار ہوتے ہیں اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اطبا سے تعاون چاہتے ہیں۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔نوخیز و نوجوان جوڑے جنھوں نے زندگی کی دہلیز پر ابھی قدم ہی رکھا ہے اپنی پسند کے جیون ساتھی کا انتخاب کر کے رشتہ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں یا خواہش رکھتے ہیں لیکن اکثر والدین، خاندان اور خاندان کا کوئی بااثر فرد اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اس کے سامنے قبیلے، ذات، برادری کا وقار اہم ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنی اولاد کو واجب القتل گردانتے ہیں اور اسے Honour Killing کا نام دیا جاتا ہے۔

''قتل برائے وقار'' ہمارا میدان نہیں۔ چونکہ اس کا تعلق میڈیکل سائنس سے کم اور عمرانیات سے زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اس افسوس ناک قتل کو مذہب اور مسلم مما لک سے ہی جوڑا جاتا ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ یہ الزام ہے بلکہ قدرے درست بھی ہے۔ خواہ ترقی یافتہ ملک بے قصور و بے سہارا لوگوں پر گولیاں برسائیں، بموں سے شہروں کو نیست و نابود کر دیں، اسکولوں میں معصوم بچوں پر قاتلانہ حملے کریں چند روز کے تذکروں کے بعد باتیں آئی گئی ہو جاتی ہے، اسے ہرگز مذہب اور تمدن سے نہیں جوڑا جاتا۔

اس مضمون میں ان افسوس ناک اموات پر کچھ معلومات فراہم کرانا چاہوں گا۔

قتل بہ جذبۂ وقار (Honour Killing) میں کسی فرد یا خاندان کے فرد واحد یا بیشتر لوگوں کا اس لیے قتل کیا جاتا ہے چونکہ اسی کے کسی معاملے میں کسی فرد یا خاندان کو ذلت ہوئی ہو یا وقار مجروح ہوا۔ سبب کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ غیر مہذب لباس سے لے کر پسند کی شادی رچانا یا جنسی تسکین کا ہی معاملہ کیوں نہ ہو۔

United Nation Population Fund (UNPF) کے اندازے کے مطابق سالانہ پانچ ہزار سے زیادہ لوگ پوری دنیا میں آنر کلنگ کے شکار ہوتے ہیں جسے نگہبانی حقوق انسانی (Human Rights Watch) بڑی وضاحت کے ساتھ کہتا ہے کہ ''قتل برائے وقار تشدد کی ایک شکل ہے جس میں مرد ممبران خانوادہ عورتوں اور اس کے خانوادوں پر حملہ کرتے ہیں چونکہ اس عورت نے خاندان کے وقار کو کم کیا ہے۔ اس کی وجہ مجوزہ رشتہ ازدواج سے انکار یا جنسی تعلقات پیدا کیے ہیں یا طلاق طلب کی ہو'' (حتیٰ کہ اس کا شوہر ناکارہ اور بد طینت ہی کیوں نہ ہو)۔

عام طور پر آنر کلنگ میں مرد عورت دونوں کو ہی مار دیا جاتا ہے اور یہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں مروج ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے سندھ میں 2002 میں 245 عورتوں اور 137 مردوں کو'' کاروکاری'' دی گئی جن میں بیشتر معاملے وہ ہیں جو اپنے قبیلہ یا خاندان سے الگ ہو کر دوسرے قبیلے میں شادی کرنے کا منصوبہ بنانے والے تھے۔

یہی نہیں بعض عورتیں جو سماج کی بندشوں کو توڑ کر اور اپنے ماحول سے نکل کر آزادانہ قدم اٹھاتی ہیں یا مذہبی رواداری کی حدود کو پار کر جاتی ہیں ان کے متعلق بھی قتل بہ جذبۂ وقار کا قانون لاگو ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض ایسے افراد جن کی پرورش ان دقیانوسی ماحول میں ہوئی ہے وہ خواہ نقل مکانی کے بعد امریکہ، کناڈا اور برطانیہ یا دیگر ترقی یافتہ ملکوں میں بس گئے ہیں وہاں بھی قانون کو بالائے طاق رکھ کر قتل کی واردات رونما ہو جاتی ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض عورتیں بھی اس فکر سے اتفاق رکھتی ہیں اور آنر کلنگ کو جائز قرار دیتے ہوئے ایسے قتل کی طرفداری کرتی ہیں۔ چونکہ ان کی پرورش بھی ایسے ہی ماحول میں ہوئی ہے اور اگر کوئی گھر کی بچی کسی بے راہ روی کی مرتکب ہوئی ہے اور جس نے فرد یا خاندان کے وقار کو گزند پہنچایا تو اسے موت کے گھاٹ اتارنا جائز قرار دیتی ہیں۔ چونکہ ان کے خیال کے مطابق اس گھر کی دوسری بچیوں کے رشتے نہیں آئیں گے اس لیے بدکردار بیٹی کا قتل ممکن ہے اس کنبے کے گناہ کو دھو سکے۔

یہی نہیں مردوں میں بھی نوجوانوں کا اغلام بازی میں ملوث ہونے پر گھر والوں نے سزائے موت دی ہے۔ اردن کے ایک نوجوان کو خود اس کے بھائی نے اس گناہ کے ارتکاب پر سر عام گولی ماردی نیز ایک ترکی طالب علم احمد ایلدیز کو بھی اس جرم کی پاداش میں گولی کھانی پڑی۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ خودکشی برائے وقار (Honour Sucide) کے لیے اکسایا گیا ہو یعنی مجرم خاتون کے بجائے قتل کرنے کے خودکشی کے لیے مجبور کیا جاتا ہے تاکہ قتل کی سزا قاتل کو نہ ملے اور مقصد بھی پورا ہو جائے۔

80 سے زائد عراقی عورتوں نے صوبہ دیالہ میں خودکشی کی چونکہ زنا بالجبر کی ذلت کو وہ دھو نہیں سکتی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ عورتیں ایک 51 سالہ معمر خاتون سمیرہ جاسم کے ذریعہ منصوبہ بند طریقے سے زنا بالجبر کی شکار ہوئی تھی اور اس خاتون نے ان بدقسمت عورتوں کو خودکش بمباری پر مجبور کیا تاکہ اس بہانے انھیں ذلت سے نجات ملے۔

اقوام متحدہ (UN) کی 2002 کی مخصوص رپورٹ کے مطابق قتل بہ جذبۂ وقار مسلم مما لک جن میں خاص کر مصر، عمان، لبنان، مراکش، پاکستان، شام، ترکی، یمن اور دوسرے

عرب ممالک میں مروج ہے نیز مغربی ممالک جیسے فرانس، جرمنی اور برطانیہ میں بھی تارکین وطن کے درمیان پایا گیا۔

انگشت نمائی والوں کو ایسے بیانوں سے اور بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ایک طرف مذہب میں عورتوں کی مساوات کی بات ہوتی ہے وہاں اعتراض کرنے والوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ مردانہ تسلط والی سوسائٹی میں عورتوں کے ساتھ نامساوی رویہ، جسمانی اور مالی استحصال کا، اس کے ساتھ ظلم وتشدد کا اس سے بہتر اور کیا نمونہ ہو سکتا ہے۔

بقول Widney Brown جو نگہبانی حقوق انسانی کے ڈائرکٹر ہیں ''یہ عمل اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ تہذیبوں سے چل کر مذہب تک پھیل گیا ہے۔''

ظاہر ہے مذہب کا تو اس میں کوئی دخل نہیں لیکن یہ عمل ایک مخصوص مذہب کے پیروکاروں میں عام ہے جو کئی تہذیبوں میں چلا آرہا ہے۔

اگر عالمی نقشے پر نظر ڈالیں تو یورپ میں جرمنی کے "DER Spiegel" نام کے جریدے میں 2005 میں ایک خبر شائع ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ گزشتہ چار ماہ میں برلن کی 6 مسلم خواتین کو ان کے ہی گھر والوں نے بے رحمانہ قتل اس لیے کیا کیونکہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ باوجودیکہ منظم طریقے سے رشتہ ازدواج میں بندھی تھیں لیکن جرمن طریقے سے زندگی گزار رہی تھیں۔

ترکی عورتوں کی ایک تنظیم پپاتیا (Papatya) کے مطابق آنر کلنگ کے 40 واقعے 1996 سے درج کیے گئے ہیں۔

برطانیہ میں دسمبر/2005 میں ایک عہدہ دار ناظر افضل نے بتایا کہ کم از کم 2004 سے 2005 کے درمیان ایک درجن آنر کلنگ کے واقعے سامنے آئے۔ برطانیہ کے ہی ''دیانا نامی'' خواتین کی تنظیم جو ایران و کرد خواتین کے حقوق کے متعلق کام کر رہی ہے کہتی ہے کہ ان اموات میں تقریباً 2/3 مسلم ہوتی ہیں مگر بقیہ ہندو، سکھ اور مشرقی یورپ سے متعلق ہوتی ہیں۔

جون 2008 میں ترکی کے وزیر اعظم کے حقوق انسانی کے ڈائرکٹر کے مطابق ہر ہفتہ ایک آنر کلنگ ہوتی ہے اور 5 سال میں تقریباً 1000 واقعات رونما ہوتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں جارڈن ایک روادار (Liberal) ملک مانا جاتا ہے لیکن وہاں بھی آنر کلنگ کے واقعے رونما ہوتے ہیں۔ وہاں مرد و زن کے مابین کوئی تفریق نہیں اور عورتوں کو اظہار رائے کی بھی اجازت ہے پھر بھی اگر کوئی مرد اپنی بیوی یا کسی عورت کو خاندانی وقار کو پامال کرنے پر قتل کرتا ہے تو اسے سزائے خفیف دی جاتی ہے۔

بعض خانوادے 18 سال سے کم عمر کے بچوں کو اس کام کے لیے استعمال کرتے ہیں چونکہ نابالغان کو جیل میں مختصر مدت کے لیے رکھا جاتا ہے اور بغیر کسی دقت کے رہا کر دیا جاتا ہے۔

2008 میں ایک سعودی عورت کو اس کے باپ نے کسی غیر مرد سے Facebook پر گفتگو کرتے دیکھ لیا تھا اور قتل کر دیا تھا۔ راز فاش اس وقت ہوا جب ایک عالم نے اپنے خطبے میں ویب سائٹ کی برائیوں پر روشنی ڈالی۔

شمالی امریکہ میں ڈاکٹر امین محمد اور ڈاکٹر سنجے پٹیل جو میموریل یونیورسٹی کناڈا سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے 2007 میں ایک سروے کے مطابق یہ پایا کہ نو آبادیات کے لیے پاکستان سے نقل مکانی کر کے کناڈا پہنچے لوگ اپنے ساتھ اپنی تہذیب و تمدن بھی لائے اور اس سے اتنا جڑے رہے کہ اس طرح کا قتل جائز سمجھنے لگے۔ پاکستان میں تو سزا سے بچ جاتے ہیں اور عدلیہ بھی اسے مذہبی رواداری کے بہانے چھوڑ دیتی ہے لیکن ترقی یافتہ ملکوں کا اپنا قانون اور اپنا طریقہ عدل ہے۔

جنوبی ایشیا میں پاکستان ہی وہ ملک ہے جس پر سب سے زیادہ انگلی اٹھتی ہے یا یوں کہیں کہ آنر کلنگ کا نام آتے ہی پاکستان سمجھا جاتا ہے۔

پاکستان میں آنر کلنگ کو ''کاروکاری'' کہتے ہیں اور یہ ایک سندھی اصطلاح ہے۔ ایک عام رائے یہ ہے کہ پاکستان میں قانون بھی اس معاملے میں تساہل دکھاتا ہے اور کاروکاری کے مختلف اسباب بھی بتائے جاتے ہیں۔ جن میں والدین کی مرضی کے مطابق شادی سے انکار یا شادی کے بعد غیر مرد سے تعلقات۔

صرف 2002 میں 382 اشخاص (245 عورتیں اور 137 مرد) صرف صوبہ سندھ میں آنر کلنگ کے شکار ہوئے اور 1999 سے 2004 کے درمیان تقریباً 4000 عورتیں قتل کی گئیں۔ اکثر و بیشتر آنر کلنگ کو ریکارڈ میں خودکشی یا اچانک موت درج کیا جاتا ہے۔

یہی نہیں ہندوستان میں بھی ستی کا رواج تاریخی اہمیت رکھتا ہے جس میں بیوی عورت خاوند کی چتا پر خودسوزی کی مرتکب ہوتی ہے یا اسے اس عمل کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ عمل بھی خاندان کے وقار کی خاطر عمل میں آتا ہے۔ بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ ستی رضا کارانہ نہیں ہوتی بلکہ اسے مجبور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ آزادی کے قبل ہی انگریزوں نے اسے ممنوع قرار دیا تھا لیکن یہ ہنوز جاری ہے۔ 1947 سے اب تک تقریباً 400 واقعات رونما ہو چکے ہیں جن میں راجستھان کے شخاوتی علاقہ میں 1987 میں روپ کنور کا مشہور واقعہ ہے۔ اس کے علاوہ شمالی ہند میں والدین کی مرضی کے خلاف دوسرے مذہب یا دوسری ذات میں شادی کر لینے سے اکثر قتل کے واقعات سننے کو مل جاتے ہیں۔

قتل ایک سنگین جرم ہے اور اس جرم کا ارتکاب روز ازل سے ہے جس کا ذکر تفصیل سے آ چکا ہے۔ یعنی آدمؑ کے بیٹے ہابیل اور قابیل کے درمیان جھگڑے میں ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کر دیا اور فوراً خداوند قدوس نے سزا بھی تجویز کر دی۔ دراصل میں اپنے مضمون میں قتل کے متعلق ہی گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر بات قتل بہ جذبۂ وقار کی ہوگئی۔

اوسطاً پوری دنیا میں اس وقت ہر سال تقریباً ایک لاکھ قتل ہوتے ہیں مگر صرف 2000 میں 520000 قتل ہوئے جن میں 10 سال اور 29 سال کے نوجوان تھے۔

مختلف ملکوں میں شرح قتل مختلف ہیں۔ بیسویں صدی میں مغربی ممالک میں تعداد کم تو ضرور ہوئی ہے لیکن پھر بھی اچھی خاصی ہے۔ اسے 4 قتل فی لاکھ افراد کیے جاتے ہیں۔

سب سے کم قتل جاپان، آئرلینڈ اور آئس لینڈ میں ہوتے ہیں جو شاید 0.5 فیصد فی لاکھ ہیں۔ مگر ترقی یافتہ ملکوں میں سب سے زیادہ شرح قتل امریکہ میں ہے۔ 2004 کے سروے کے مطابق یہ شرح 5.5 افراد فی لاکھ جبکہ بڑے شہروں میں یہ شرح 40 فی لاکھ بھی پائی گئی ہے۔

جن ممالک میں یہ واقعات زیادہ ہوتے ہیں ان میں اس کی شرح درج ذیل ہے:

برازیل	-	55,000 ہر سال قتل ہوتے ہیں
روس	-	30,000
کولمبیا	-	25,000

ساؤتھ افریقہ	ـ	20,000
امریکہ	ـ	17,000(1960-96 تک 666,160)
میکسیکو	ـ	15,000
ونےزویلا	ـ	11,000
ایلسیلواڈور	ـ	6,000
جمائیکا	ـ	1,600
فرانس	ـ	1,000
کناڈا	ـ	580
چائیل	ـ	200
ہندوستان	ـ	32,719
پاکستان	ـ	9,631

OOO

قتل

(Murder)

قتل ایک سنگین جرم ہے چونکہ ایک انسان دوسرے انسان کو صفحۂ ہستی سے ہٹا دیتا ہے خواہ اس کی نیت یا منشا بغض وعناد، کینہ وحسد ہی کیوں نہ ہو۔ ہر حال میں ہر ملک اور ہر تہذیب میں اسے سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔ ہر ملک میں قاتل کی سزا سخت سے سخت ہے۔ عام طور پر قاتل کی سزا موت، عمر قید یا سزا معینہ ہوتی ہے۔ قتل کرنے والا قاتل کہلاتا ہے اور جس کا قتل ہوا وہ مقتول ہوتا ہے۔

ہر قتل کے پیچھے قاتل کی ایک منشا ہوتی ہے، کچھ حالات ہوتے ہیں اور قتل کے ارتکاب میں کوئی نہ کوئی حربہ ہوتا ہے۔ قانون طبی میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور ملزم کی گرفتاری اور تفتیش میں اقبال جرم نیز حربہ کی پہچان وغیرہ میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس سے پہلے کہ تفصیلات میں جائیں بعض اصطلاحات سے مانوس ہونا ضروری ہے۔

حملہ (Assault) جسے طب قانونی میں اکثر استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی ہیں کہ کسی شخص کو دھمکی دی جائے یا کسی کے خلاف جارحانہ کارروائی کی جائے اور اسے جسمانی نقصان پہنچے خواہ وہ دست وگریبان ہی ہوا ہو جسے Battery کہتے ہیں۔

مجرم قابل دست اندازی پولس (Cognisable Offence) یہ ایسا جرم ہے جس میں پولس کو بغیر کسی وارنٹ کے مجرم کو گرفتار کرنے کی اجازت ہے۔ جیسے قتل، عصمت دری یا اغوا۔

قتل نفس (Homicide): عام طور پر کسی شخص کو اس کے عمل کے ردعمل میں قتل کرنا ہے جو قانونی (Lawful) بھی ہو سکتا ہے اور غیر قانون (Unlawful) بھی۔ قانونی قتل کے دائرے میں قابل توجیہ (Justifiable) یا جائز قتل قابل معافی (Excusable) دونوں ہو سکتے ہیں۔

قابل توجیہ قتل وہ ہو سکتے ہیں جو حالات پر منحصر ہوں جیسے

- ✡ عدالتی پھانسی یا گردن زنی
- ✡ بلووں کے روکنے یا دبانے میں
- ✡ اپنی دفاع یا کسی غیر کی دفاع میں
- ✡ شدید دست درازی سے بچانے جیسے عصمت دری، قتل، ڈکیتی جیسے واقعات میں

قابل معافی قتل وہ ہو سکتے ہیں جو مندرجہ حالات میں ہوئے ہوں۔

- ♦ اپنی دفاع اور اچانک پیدا ہونے والے جھگڑے
- ♦ کسی غیر کی جان و مال کی دفاع میں
- ♦ بچنے کی دوسری کوئی تدبیر نہ ہو
- ♦ کھیل کود کے دوران جیسے کشتی، مکہ بازی وغیرہ

غیر قانونی قتل کے معاملے کا موت کی حقیقت اور قاتل کی ذہنی کیفیت پر انحصار ہوتا ہے جیسے کینہ اور بغض (Malice Aforethought) ہوتا ہے جسے Culpable Homicide کہتے ہیں لہٰذا قتل کے سلسلے میں ہندستانی عدلیہ میں دفعہ۔ سیکشن 300 انڈین پینل کوڈ (IPC) میں کسی شخص کا قتل ہونے پر قاتل پر فرد جرم عائد کرنے کے لیے چار باتیں ضروری مانی جاتی ہیں۔

(1) قتل کا مقصد و منشا
(2) قتل کے عمل کی تیاری
(3) کینہ اور بغض
(4) عدم موجودگی یا ثبوت مٹانے کی کوشش

قتل کی دوسری شکل یہ بھی ہوسکتی ہے جس میں قتل بلاارادہ ہوا ہو جسے آرٹیکل 299 میں درج کیا گیا ہے جس میں تین باتیں ہوسکتی ہیں:

(1) قاتل نے حملہ تو کیا مگر ضروری نہیں کہ جان لے لے۔

(2) جس میں ارادہ قتل نہ ہو لیکن موت واقع ہو جائے جیسے بیہوشی دیتے مریض کی موت ہو جائے

(3) جب قانونی اجازت ہو مگر بے جا استعمال جیسے اندھادھند کار چلانے میں (IPC 304-A)۔

قاتل کی سزاؤں کا معیار بھی مختلف ملکوں میں مختلف ہے اور ہر ملک کا یکساں نہیں ہوتا تاہم قتل کو سنگین جرم سبھی مانتے ہیں۔قتل کی تعریف بھی الگ الگ ملکوں میں یکساں نہیں جیسے کناڈا میں قتل کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جسے فرسٹ ڈگری اور سیکنڈ ڈگری مرڈر نام دیا جاتا ہے۔

فرسٹ ڈگری مرڈر واقعتاً قتل ہے جو

(1) جانتے بوجھتے منصوبہ بند ہوتا ہے

(2) یا کسی کو ٹھیکہ دیا گیا ہو جسے عام طور پر ہندوستان میں سپاری دینا کہا جاتا ہے

(3) امن کے شعبہ کے کسی افسر کا قتل

(4) ارتکاب جرم یا کوشش جرم جیسے اغوا، جنسی جبر، ہتھیار کے زور پر کسی کو یرغمال بنانا

(5) کسی کو مجرمانہ پریشانی میں ڈالنا

(6) دہشت گردی

(7) کسی مجرم تنظیم کے ساتھ مل کر انجام کا پلان

(8) دھمکی دینا وغیرہ

سیکنڈ ڈگری مرڈر میں وہ تمام قتل جو فرسٹ ڈگری میں شمار نہیں ہوئے اور وقتی ردعمل کے نتیجے میں سرزد ہوئے ہوں۔

کسی بالغ کے لیے کناڈا میں قتل کی سزا تاعمر قید ہے مگر قاتل عارضی رہائی (Parole) کے لیے عرضی دے سکتا ہے۔

فرسٹ ڈگری قتل کا مجرم عارضی رہائی کے لیے 25 سال بعد عرضی دے سکتا ہے اور سیکنڈ ڈگری قتل کا ملزم 10 سے 25 سال کے بعد عرضی دے سکتا ہے۔

اسی طرح چین میں 1997 میں ترمیم ہوئے قانون کے مطابق قتل کی سزا موت ہے یا عمر قید نیز قصداً قتل کرنے پر عمر قید یا 10 سال سے کم ہرگز نہیں تاہم دفاعی عمل میں عمداً قتل ہوا تو 3 سال سے کم قید نہیں۔

ڈنمارک میں قصداً کسی کو قتل کرنے کی سزا کم از کم 5 سال سے عمر قید تک ہوسکتی ہے۔ وہیں فن لینڈ میں گرچہ سزا عمر قید ہے لیکن 12 سے 14 سال قید کے بعد قاتل اپیل کرسکتا ہے لیکن معافی از خود نہیں ہوتی، بلکہ صدر مملکت معافی دیتا ہے۔

2000 سے قبل عام طور پر صدر تقریباً ہر قاتل کو معافی دے دیتا تھا لیکن 2006 میں ترمیم کے بعد ہر معاملہ کا جداگانہ عدل کا معیار مقرر ہوا۔

فرانس میں قاتل کو 30 سال قید بامشقت عموماً ہوتی ہے وہیں جرمنی میں بھی عمر قید ہے لیکن 18-17 سال کے بعد قتل کی سنگینی کو دیکھ کر سزا کم ہوجاتی ہے۔

اٹلی میں آرٹکل 575 کے مطابق قاتل کو کم از کم 21 سال کی جیل ہوتی ہے مگر بعض مخصوص حالات میں تاعمر قید بھی ہوتی ہے۔

ناروے کا قانون بھی مختلف ہے اور قتل کے تین درجے ہیں اور سزائیں بھی ان درجات کے مطابق ہوتی ہیں۔

(1) منصوبہ بند قتل۔ یعنی فرسٹ ڈگری مرڈر۔ 21 سال تک قید

(2) قصداً قتل۔ یعنی سیکنڈ ڈگری مرڈر۔ 6 سے 12 سال تک قید

(3) بے توجہی سے قتل۔ جیسے ڈرائیور کی بے توجہی سے موت۔ 3 سے 6 سال تک قید۔

روس میں قصداً قتل کو ہی قتل مانا جاتا ہے اور قید 8 سے 20 سال ہوتی ہے۔ امریکہ سب سے ترقی یافتہ ملک مانا جاتا ہے اور وہاں قتل اور قاتل کی سزائیں مختلف اسٹیٹ میں مختلف ہیں۔ پھر پورے ملک کا الگ قانون مگر نہایت پیچیدہ۔ اور امریکہ میں قتل کی سزا 349 مہینے (یعنی 29 سال ایک ماہ) اور زیادہ سے زیادہ 480 (یعنی 40 سال) ہے۔

یہ سارے قانون انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں جو وقتاً فوقتاً حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں اور سقم کے باعث بچنے کی راہیں (Loop Hole) بھی کھلی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں قتل اور قاتل کے متعلق کیا قانون ہے۔ چونکہ اسلام مکمل نظام حیات ہے اور روزمرہ سے لے کر مخصوص حالات کے لیے بھی ایک نظام ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِيْ الْقَتْلَ."

("اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص [بدلہ] لینا فرض کیا گیا ہے۔")

(البقرۃ: آیت 187)

زمانہ جاہلیت میں کوئی نظم اور قانون تو تھا نہیں اس لیے زور آور قبیلے کمزور قبیلوں پر جس طرح چاہتے ظلم و جور کا ارتکاب کرتے۔ کسی کمزور قبیلے کے کئی مردوں کو، بلکہ بسا اوقات پورے قبیلے ہی کو تہس نہس کرنے کی طاقتور قبیلے کوشش کرتے۔ جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے اتنی ہی قیمت کا خون اس خاندان یا قبیلے یا قوم سے چاہتے تھے جس کے آدمی نے اسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سیکڑوں سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا کوئی معزز آدمی اگر دوسرے گروہ کے کسی چھوٹے آدمی کے ہاتھ مارا گیا ہو تو وہ اصلی قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی کہ قاتل کے قبیلے کا کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے یا اس کے کئی آدمی ان کے مقتول پر سے صدقہ کیے جائیں۔ برعکس اس کے اگر مقتول ان کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجے کا شخص اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزت رکھنے والا شخص ہوتا تو وہ اس بات کو گوارہ نہ کرتے تھے کہ مقتول کے بدلے قاتل کی جان لی جائے اور یہ حالت کچھ قدیم جاہلیت ہی میں نہ تھی، موجودہ زمانے میں جن قوموں کو انتہائی مہذب سمجھا جاتا ہے، ان کے باقاعدہ سرکاری اعلانات تک میں بسا اوقات یہ بات بغیر کسی شرم کے دنیا کو سنائی جاتی ہے کہ ہمارا ایک آدمی مارا جائے گا تو ہم قاتل کی قوم کے پچاس آدمیوں کی جان لیں گے۔

اکثر یہ خبریں سننے کو ملتی ہیں کہ ایک شخص کے قتل پر مغلوب قوم کے اتنے یرغمال گولی سے اڑائے گئے۔

ہم نے گزشتہ صدی میں دیکھا کہ وزیر اعظم کے قتل کے بعد کیا ہوا۔ کتنے بے گناہ اور معصوموں کی جان کیسے اور کس طرح لی گئی۔ ہر زمانے میں یہ ہوتا رہا ہے اور جاہلیت و تعلیم اور ترقی یافتہ دور میں بھی حادثات ہو رہے ہیں۔

یہی نہیں نام نہاد مہذب قوموں کی باضابطہ عدالتوں تک کا یہ طرز عمل رہا ہے کہ اگر قاتل حاکم قوم کا فرد ہو اور مقتول کا تعلق محکوم سے ہے تو ان کے جج قصاص کا فیصلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

یہی خرابیاں ہیں جن کے سدباب کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل اور صرف قاتل ہی کی جان لی جائے قطع نظر اس سے کہ قاتل کون ہے اور مقتول کون۔

> ''......آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت......''

اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے دور میں موجود فرق و امتیاز کو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ جو قاتل ہوگا قصاص میں اس کو قتل کیا جائے گا۔ قاتل آزاد ہے تو بدلے میں وہی آزاد غلام ہے تو بدلے میں وہی غلام اور عورت ہے تو بدلے میں وہی عورت قتل کی جائے گی نہ کہ غلام کی جگہ آزاد اور عورت کی جگہ مرد یا ایک مرد کے بدلے متعدد مرد۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ مرد اگر عورت کو قتل کردے تو قصاص میں عورت قتل کی جائے گی، یا عورت مرد کو قتل کردے تو کسی مرد کو قتل کیا جائے گا بلکہ یہ الفاظ شان نزول کے اعتبار سے ہیں جس میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قصاص میں قاتل ہی کو قتل کیا جائے گا چاہے مرد ہو یا عورت، طاقتور ہو یا کمزور۔

قرآن کریم میں سورہ البقرہ کی مختصری آیت میں ایک بڑے قانونی مسئلہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ذرا آیت کریمہ کے بقیہ حصوں کو دیکھیں تو یہ بھی وضاحت کی ہے کہ:

''فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ.''

(''......ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو تو معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خوں بہا ادا کرے۔'')

(سورہ البقرہ، آیت:128)

''بھائی'' کا لفظ فرما کر نہایت لطیف طریقے سے نرمی کی سفارش بھی کردی ہے۔ یعنی دو شخص کے درمیان بیر، بغض وعداوت ہی سہی مگر ہے تو انسانی بھائی لہٰذا اگر اپنے خطا کا بھائی کے مقابلے میں انتقام کے غصے کو پی جاؤ تو یہ انسانیت کے شایان شان ہوگا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلامی قانونی تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ بھی قاتل راضی نامہ ہے۔ مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قاتل کو معاف کردیں اور اس صورت میں عدالت کے لیے جائز نہیں کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے۔ سعودی عرب میں یہ مروج ہے اور آج بھی آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن میں سر قلم کے لیے اٹھی تلوار اس وقت رک جاتی ہے جب وارث قاتل کا جرم بخش دیتا ہے۔

خوں بہا اور بخشائش مملکت سعودی عرب کی شان ہے اور وہاں کی عدالت بھی اس سلسلے میں مدد کرتی ہے۔ آیت مقدسہ کے آخری حصے میں اللہ عزوجل یہ بھی فرماتا ہے کہ:

''ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ''

(......یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف ہے اور رحمت ہے اس پر بھی جو زیادتی کرے، اس کے لیے دردناک سزا ہے۔'')

(البقرہ، آیت:178)

زیادتی کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کا وارث خوں بہا وصول کرنے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے، یا قاتل خوں بہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو

احسان اس کے ساتھ کیا اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔ اس آیت کے بعد کی دوسری آیت میں قصاص کی اہمیت کو اللہ تعالی نے واضح کیا ہے کہ:

"وَلَكُمْ فِيْ الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِيْ الأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ "

("عقلمندو! قصاص میں تمھارے لیے زندگی ہے اس باعث تم قتل ناحق سے رکو گے۔") (البقرہ، آیت:179)

جب قاتل کو یہ خوف ہوگا کہ میں بھی قصاص میں قتل کر دیا جاؤں گا تو پھر اسے کسی کو قتل کرنے کی جرأت نہیں ہوگی اور جس معاشرے میں یہ قانون قصاص نافذ ہو جاتا ہے وہاں یہ خوف معاشرے کو قتل و خونریزی سے محفوظ رکھتا ہے، جس سے معاشرے میں نہایت امن اور سکون رہتا ہے۔ اس کا مشاہدہ آج بھی سعودی عرب میں کیا جاسکتا ہے۔

OOO

اسقاط حمل

(Abortion)

میں قتل کی مختلف قسموں کے متعلق لکھنے بیٹھا تو خیال آیا کہ قتل جنین (Foeticide) پر کچھ معلومات فراہم کی جائیں۔ بہتیرے مضامین، مقالات اور انٹرنیٹ پر مختلف سائٹ کو سرچ کرنے پر میری معلومات میں اضافہ یہ ہوا کہ بیشتر لوگوں نے ''قتل جنین'' کو ''قتل جنین مادہ'' ہی مانا ہے جیسے کہ قتل جنین نر تو اس زمرے میں آتا ہی نہ ہو۔ یعنی قتل جنین بنام ''قتل جنین مادہ'' جبکہ ایسا ہرگز نہیں۔ قتل جنین کا دوسرا نام اسقاط حمل بھی ہوسکتا ہے۔ چونکہ اسقاط حمل یعنی Abortion میں نر و مادہ کا خیال نہیں کیا جاتا اور ہر حال میں حمل کو ختم کرنا ہے۔ اب مجھے فی الوقت اسقاط حمل پر ہی لکھنا پڑ رہا ہے۔ چونکہ یہ کم اہم نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر اسقاط حمل ہے کیا، اس کی کتنی قسمیں ہیں اور پس پردہ کیا کچھ نہیں ہوتا۔

اسقاط حمل۔ یعنی حمل کا ختم کرنا۔ جس میں رحم مادر سے جنین یا ایمبریو (Embryo) کو نکالنا جس کے نتیجے میں جنین کی موت ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی منصوبہ بند عمل کے بعد ہی اسقاط حمل ہو بلکہ زمانہ حمل میں کسی بھی پیچیدگی کے نتیجے میں اسقاط ممکن ہے۔

عام طور پر حاملہ عورت کی صحت کا خیال کرتے ہوئے اور اس کی زندگی کو اہمیت دیتے ہوئے

حمل اسقاط (Induce) کیاجاتا ہےاوراس عمل کوطبی اسقاط حمل یعنی Therapeutic Abortion کہا جاتا ہے۔ لیکن کسی اور سبب سے اسقاط حمل کرانے کو Elective Abortion کا نام دیا جاتا ہےاور یہی عمل خود بخود ہوجائے تو اسے Miscarriage کہا جاتا ہے۔

اسقاط حمل کی ایک طویل تاریخ ہے اور زمانہ قدیم میں مختلف طریقے بھی ایجاد ہوئے جن میں سب سے عام طور پر جڑی بوٹیوں کا سہارا لیا جاتا یا پھر تیز نوکیلے دھاردار اوزار بھی استعمال ہوئے نیز جسمانی چوٹ اور ٹریڈیشنل طریقے بھی استعمال ہوئے لیکن دور جدید میں دوائیں اور عمل جراحی سے ہی اسقاط حمل ہوتا ہے۔

اسقاط کے متعلق قانون، اس کا چلن اور تہذیبی نقطۂ نظر پوری دنیا میں مختلف ہے۔ اسقاط اور اسقاط سے جڑے مسائل پر عوام میں مختلف رائے ہے اور اس کے اخلاقی پہلوؤں نیز قانونی پیچیدگیوں پر اختلاف رائے ہے۔

اسقاط اور اس سے متعلق مسائل بعض ملکوں میں سیاسی مسئلہ ثابت ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں "Pro-Life" Pro-Choice کا بین الاقوامی سماجی موومنٹ بھی فعال ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسقاط کی شرح میں عالمی طور پر کمی آئی ہے۔ چونکہ فیملی پلاننگ کی تعلیم اور حمل سے بچنے کے طریقے عام ہوئے اور عوام میں بیداری پیدا کی گئی ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ Spontaneous Abortion کو Miscarriage کہتے ہیں جو کسی چوٹ یا قدرتی اسباب سے ہوجاتا ہے مگر عام طور پر اسقاط لونیہ (Chromosome) کے غیر متوقع تقسیم کی بنا پر ہوتا ہے۔ انسان میں 46 کروموزوم ہوتے ہیں۔ بیضہ اور منی میں آدھے ہوتے ہیں۔ دو کروموزوم جنسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اس لیے انھیں جنسی کروموزوم کہتے ہیں باقی آٹوسوم کہلاتے ہیں۔ جنسی کروموزوم مادہ میں XX اور نر میں XY ہوتے ہیں۔ کوئی حمل جو 37 ہفتوں سے قبل ختم ہوجائے اور بچہ زندہ رہ جائے تو اسے Pre-mature birth کہا جاتا ہے۔

اسقاط کے متعلق بعض اصطلاحات بھی جاننا ضروری ہے چونکہ ان کا ذکر آگے آئے گا۔
اسقاط (Abortion) لاطینی لفظ ابورٹس (Abortus) سے ماخوذ ہے جس کے معنی

قبل از وقت پیدائش، یعنی اگر حمل کے دوران بچہ ضائع ہو جائے یعنی ماں کے رحم سے باہر آ جائے تو اسے اسقاط کہتے ہیں یعنی جنین کے قبل از وقت اخراج کو اسقاط کہا جاتا ہے۔

- اسقاط ارادی سے مراد جان بوجھ کر حمل گرانا ہے۔
- پورا بیضہ خارج ہو جائے تو اسے اسقاط مکمل کہا جاتا ہے۔
- بلاضرورت طبی حمل گرانا اسقاط مجرمانہ کہلاتا ہے۔
- اسقاط عادی سے مراد بار بار حمل گرانا ہے۔
- اسقاط ناقص سے مراد آنول کا کچھ حصہ رحم میں رہ جانا ہے۔
- اسقاط ناگزیر سے مراد طبی مشورہ پر مجبوراً اسقاط کرانا ہے۔

اکثر اسقاط (Abortion) اسقاط حمل (Miscarriage) اور قبل از وقت ولادت (Premature Labour) یہ ساری اصطلاحات قانون کی روشنی میں ایک ہی مانے جاتے ہیں اور سب کو اسقاط ہی کہا جاتا ہے۔

طبی قانون کے مطابق اسقاط کی درجہ بندی بالکل مختلف طریقے سے کی جاتی ہے۔

(1) قدرتی یا اچانک اسقاط کو طبیعی اسقاط کہتے ہیں۔

(2) غیر طبیعی اسقاط کا مطلب حاملگی کے دوران چھیڑ چھاڑ کے نتیجہ میں ہونے والے اسقاط ہیں جس کے دو ذیلی حصے ہیں۔

(i) قانونی یا اسقاط ناگزیر

(ii) اسقاط مجرمانہ

☆ قدرتی یا اچانک (Spontaneous) حادثاتی اسقاط ہوتا ہے جو 10 سے 15 فیصد ہوتا ہے اور اس کے اسباب ہیں۔

(1) حاملہ کی بیماریاں جیسے تیز بخار، عفونتی امراض، سوزاک وغیرہ میں

(2) مقامی بیماریاں جن میں اعضا تناسل سے متعلق عفونت، رسولی اور رحم کے نقص

(3) اچانک شوک، خوف، غم اور بعض رد عمل کی بنا پر

(4) ناگہانی چوٹ، پیٹ پر ضرب

(5) بعض اسباب جو جنین کی رحم میں موت کا باعث بنے ہوں جیسے نقص رشد، سوزاک وغیرہ

مصنوعی اسقاط۔ وہ ہے جو براہ راست حاملگی میں خلل پیدا کرنے سے ہو۔

☆ قانونی اسقاط حمل۔ جسے عام فہم زبان میں Medical Termination of Pregnancy (MTP) کہتے ہیں۔ یعنی 1971 ایکٹ کے مطابق قانونی جواز رکھتا ہو جیسے:

(1) معالجاتی (Therapeutic)

(2) اصلاح نسل (Eugenic)

(3) بہبودی بشر (Huminatarian)

(4) سماجی (Social)

اب ان تمام جواز کو فرداً فرداً دیکھیں تو

☆ معالجاتی:

یعنی ایسی حالت جہاں اگر حاملگی برقرار رہی تو حاملہ کی جان کو خطرہ ہو یا پھر حاملہ کی جسمانی اور ذہنی صحت پر اثر پڑ رہا ہو۔ جیسے

(1) قلبی بیماریاں، ٹی۔ بی، شدید ذیابیطس

(2) فشار خون جو قلب اور گردہ پر اثر انداز ہو

(3) گردہ کا شدید مرض

(4) امراض جگر و لبلبہ

(5) حاملگی کے دوران خون میں عفونت

(6) خونریزی

(7) سرطان سینہ یا اندام نہائی

(8) بار بار سیزیرین اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات

(9) دماغی توازن کا بگڑ جانا

☆ اصلاح نسل:

وہ حالات جن میں معلوم ہے کہ حاملگی کو اگر قائم رکھا گیا تو ہونے والا بچہ جسمانی یا دماغی معذور ہوگا جیسے

(1) خسرہ جرمن

(2) چیچک

(3) وائرل ہپٹائٹس

(4) بار بار ایکسرے کے استعمال سے ریڈیئشن کا خطرہ

(5) اگر حاملہ نے Cytotoxic دواؤں کا استعمال کیا ہو

(6) جب والدین دماغی خلل میں مبتلا ہوں اور بچے میں بھی آنے کا خطرہ ہو

(7) کروموزومل بے ترتیبی ہو

☆ بہبودی بشر:

یا انسانیت کی بنیاد پر ایسے مسائل جن کا دیرپا اثر ہو جیسے حاملگی کا تعلق زنا سے ہو۔

WHO کے مطابق صحت کا مقصد صرف یہ نہیں کہ انسان کسی مرض سے پرے ہو بلکہ یہ ایک مثبت حالت ہوتی ہے جس میں جسمانی اور ذہنی نیز سماجی بہبودی ہو لہٰذا اگر زنا کی وجہ سے کوئی حاملہ ہوگئی ہو تو اسے ایک قسم کی ذہنی الجھن میں صدا رہنا ہوگا جو اس کی دماغی صحت پر اثر کرسکتی ہے۔

☆ سماجی اسباب:

یہ وہ حالت ہے جہاں شادی شدہ عورت کو مانع حمل وسیلوں کے ناکامی کی بنا پر حمل ٹھہر جانے یا حاملہ عورت جس ماحول میں رہ رہی ہے اور اسے یہ مدت ایسے ہی ماحول میں گزارنی ہے جو ناموافق و ناسازگار ہے اور اس کا اثر حامل کی صحت پر پڑے گا تو اسقاط کی اجازت ہے۔ کوئی بھی مانع حمل ترکیب صد در صد کامیاب نہیں لہٰذا کوئی فیملی پلاننگ کا خواہشمند اگر کسی طریقے سے ناکامیاب ہوتا ہے اور اس کی خاندانی زندگی یا ازدواجی زندگی پر اثر پڑتا ہے تو اس کی دماغی صحت پر بھی اثر پڑتا ہے۔

☆ ماحولیاتی:

حاملگی ماحولیات کی بنیاد پر بھی ختم کی جاتی ہے جیسے:

(1) اگر کوئی عورت قلبی مرض میں مبتلا ہو اور گھر میں کوئی دوسرا معاون یا مددگار نہ ہو اور حاملہ ہونا اس کے لیے دشوار کن ہو تو وہ یہ فیصلہ کر سکتی ہے۔

(2) اگر بچے کی پیدائش کے بعد مالی تنگی کا خدشہ ہو اور غربت کے آثار ہوں تو اس حالت میں بھی حمل کو ضائع کیا جا سکتا ہے۔

(3) اگر کسی عورت کے دو بچے ہوں، گھر کا کام کاج خود کرتی ہو اور ایک ہی کمرہ میں اس کا سب کچھ ہو تب ممکن ہے حمل سے نجات پا جائے۔

(4) اگر حاملہ کسی معذور بچے کی ماں پہلے سے ہی ہو جس کی نگہداشت ایک مسئلہ ہو اور نومولود کو سنبھالنا مشکل ہو تو اس وقت کے باعث اسقاط ممکن ہے۔

طبی اسقاط ایکٹ کے تحت حمل ختم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل ضروریات اور حالات طے کیے گئے ہیں:

☆ اضطراری (Emergency) حالت:

کوئی بھی رجسٹرڈ طبیب خواہ وہ امراض نسواں واولاد میں تجربہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور خواہ حاملہ کے جتنے دنوں کی بھی حاملگی ہو اگر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ حاملہ کی زندگی بچانی ہے تو وہ حمل ختم کر سکتا ہے۔

اضطراری حالت کے علاوہ اگر حمل 12 ہفتوں سے زیادہ نہیں ہے تو کوئی بھی رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنر اسقاط کرا سکتا ہے لیکن مدت حاملگی 12 سے زیادہ اور 20 سے کم ہو تو کم از کم دو پریکٹشنر کی رائے ضروری ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ

(1) دونوں ہی عورت کی بہبود دیکھتے ہوئے فیصلہ کریں

(2) رجسٹرڈ پریکٹشنر کو خاصہ تجربہ ہو

(3) وہ رجسٹرڈ باڈی سے سند یافتہ ہو

(4) یہ عمل سرکاری یا سرکار سے منظور شدہ اسپتال میں ہو

(5) عورت سے تحریری اجازت ضروری ہے، شوہر کی اجازت کی ضرورت نہیں اور اگر وہ نابالغ ہو یا دماغی توازن ٹھیک نہ ہو تو تحریری اجازت گارجین سے لینی ضروری ہے۔

☆ مجرمانہ اسقاط(Criminal Abortion):

ہندوستان میں عام طور پر کثرت سے ایسی بیوہ عورتیں ہیں جنھیں سماجی روایات کے دباؤ میں دوبارہ شادی کی اجازت نہیں ہوتی یا شادی شدہ عورتیں جنھیں مزید اولاد نہیں چاہیے وہ اسقاط کراتی ہیں جو قانون کی نظر میں جرم ہے۔

تقریباً تمام مجرمانہ اسقاط دوسرے اور تیسرے ماہ حاملگی میں ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اس وقت تک عورت کے حیض رک جانے تیز صبح کو بدلی ہوئی کیفیات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ حاملہ ہے۔ یہ وقت اس لیے انتخاب کیا جاتا ہے تا کہ دوسروں کو اس کی بھنک بھی نہ ہو۔

مجرمانہ اسقاط کے قوانین سخت ہیں اور سیکشن 312 سے 316 انڈین پینل کوڈ کے دائرے میں آتے ہیں اور سزا 3 سے 15 سال قید ہو سکتی ہے۔

مجرمانہ اسقاط کے لیے عام طور پر دو طریقے اپنائے جاتے ہیں

(1) ادویات کی مدد سے

(2) مشینی یا دوسرے عملی طریقے

ادویات:

بہتیری قسم کی دوائیں اسقاط کے لیے استعمال کی جاتی ہیں جن کا اثر رحم کے جنین پر نہیں ہوتا لیکن اگر اس کی مقدار زہریلی حد تک دی جائے تو نتیجتاً اسقاط ہو جاتا ہے۔

مگر نقصان یہ ہے کہ اسقاط کے بجائے حاملہ کی موت کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ اسقاط آور دوائیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔

(1) وہ دوائیں جو براہ راست رحم پر اثر پذیر ہوتی ہیں۔

(2) وہ دوائیں جو بالواسطہ رحم پر اثر پذیر ہوتی ہیں۔

وہ ادویات جو رحم مادر پر براہ راست اثر کرتی ہیں اور جو واضع حمل (Ecobolic) دوائیں کہلاتی ہیں جس کے استعمال میں سکڑن پیدا ہوتی ہے یا یہ دوائیں سکڑن کو تحریک دیتی ہیں اور رحم میں موجود مواد کو باہر دھکیلنے میں تیزی پیدا کرتی ہیں۔

حمل کو ساقط کرنے والی دواؤں میں ارگٹ (Ergot)، کونین (Qunine)، اور Cotton Root Bark اور غدہ نخامی کا ست (Pituitary Extract) وغیرہ ہیں۔

وہ ادویات جو رحم مادر پر براہ راست اثر نہیں کرتی ہیں مگر استعمال ہوتی ہیں (Emetics) جُلاب (Purgative) اور بعض دھات (Metals) ہندوستان میں عام طور پر بیج یا کچے پھل Carcia Papaya اناس کے کچے پھل، گاجر کے بیج، مدار کا دودھ، لال چترا کے پتے، کریلا وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔

جڑی بوٹی اور ادویات کے علاوہ دوسری شکل Mechanical Violance ہوتا ہے جس میں ایک تو عام (General) اور دوسرا مقامی (Local) ہوسکتا ہے۔ عام تشدد براہ راست رحم حاملہ پر ہوتا ہے اور اس کے سبب پیڑو کے اعضا میں اجتماع خون پیدا کرتا ہے جس کے سبب رحم اور جھلی کے درمیان خونریزی ہو جاتی ہے۔

(1) خراش پیدا ہوتی ہے اور عفونتی اسقاط (Septic Abortion) ہو جاتا ہے

(2) دہانہ رحم پھیل جاتا ہے اور جھلی کے پھٹنے یا نہ پھٹنے پر طبی اسقاط ہو جاتا ہے

اور اس میں جو طریقہ اس کے لیے اپنایا جاتا ہے وہ

(1) خود سے Self Instrumentation

(2) اسقاطی ڈنڈی Abortion Stick

(3) رحم کے اندر سرنج سے تیز مائع ڈالنا

(4) دہانہ رحم کو پھیلانا

(5) رحم کے اندر جھلی کو پھاڑنا

(6) کھرچنا (Curettage)

(7) بجلی کا استعمال وغیرہ ہیں۔

ہندوستان میں خصوصاً دیہاتوں میں مڈوائف یا حمل گرانے والی عورتیں Abortion Stick استعمال کرتی ہیں۔ یہ لکڑی یا تو بانس کی باریک ڈنڈی جو 15 سے 20 سینٹی میٹر کی ہوتی ہے یا پھر کسی بھی سوزش یا خراش پیدا کرنے والی شاخ جیسے مدار، چترا، لال چترا یا کنیر کی ڈنڈی استعمال کی جاتی ہے جس کے ایک سرے پر روئی لپیٹ دی جاتی ہے اور خراش آور مادہ جیسے سنکھیا، لال جستہ یا Asafoetids میں بھگولیا جاتا ہے اور دہانہ رحم سے داخل کیا جاتا ہے جس سے اسقاط ہوجاتا ہے۔

یہ باتیں تو ہندستانی پس منظر میں تھیں مگر یورپی دنیا میں خاص کر یورپ و امریکہ میں جو طریقہ استعمال ہوتا ہے اس میں میڈیکل Abortion کے لیے کچھ Pharmaceutical Drugs پہلے تین ماہ حاملگی میں استعمال ہوتی ہیں جیسے Methotrexate یا Prostaglandin بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

سرجیکل Abortion میں:

پہلے آٹھ ہفتے میں Vacum Aspiration

پہلے بارہ ہفتے میں Suction Aspiration

15 ہفتہ سے 26 ہفتوں میں Dilatation & Evacuation

Dilatation & Curettage دوسرا پسندیدہ آپریشن بھی ہوتا ہے۔

20 سے 23 ہفتہ میں ایک انجکشن Fetal Heart کو روکنے کے لیے دیا جاتا ہے تاکہ اسقاط کے پہلے بچہ ماں کے رحم میں ہی فوت ہوجائے پھر اسقاط کرایا جاتا ہے۔

اب ذرا دنیا میں ہورہے اسقاط پر بھی نظر ڈال لیں۔ایک رپورٹ کے مطابق 1995 میں تقریباً 46 ملین اسقاط ہوئے جس میں 26 ملین ان خطوں میں ہوئے جہاں اسقاط پر پابندی نہیں مگر 20 ملین ایسے ملکوں میں اسقاط ہوئے جہاں یہ غیر قانونی ہے۔روس میں 62 فیصد اور ویتنام میں 43 فیصد۔

WHO کے اندازے کے مطابق 19 ملین غیر محفوظ اسقاط ہر سال ہوتے ہیں جن میں 68 ہزار عورتوں کی موت بھی ہوجاتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 1995 میں 46 ملین سے گھٹ کر 2003 میں 41 ملین اسقاط ہوئے۔تمام انسانوں کی زندگی اللہ کی نظر میں متبرک ہے۔حمل قرار ہونے سے لے کر قدرتی موت

تک زندگی کہلاتی ہے۔خدائے بزرگ و برتر خالق کائنات ہے اور کسی بھی انسان کو اپنی مرضی سے اسے ختم کرنے کی اجازت نہیں۔خودکشی، قتل رحمی، غذا سے انکار اسلام میں ممنوع ہے۔

اسلام میں عورتوں کو شادی کرنے، حمل میں رہنے اور حمل کو انجام تک پہنچانے کی ترغیب دی گئی ہے۔خداوند قدوس ہی حمل کو باقی رکھنے یا ختم کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

ہر حمل حلال ہے اور ہر حمل کا انجام افزائش نسل ہے اور کسی بھی حالت میں غیر مطلوب حمل یعنی Unwanted Pregnancy نہیں کہا جا سکتا۔ ہر بچہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارسال کردہ تحفہ ہوتا ہے اسی لیے اسلام میں اسقاط حمل کی ممانعت ہے۔اسقاط کا تعلق مذہب سے بھی ہے۔ چونکہ اکثر مذاہب میں اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔اسلام میں بھی بعض استثناء کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے۔

راشٹریہ سہارا کا ضمیمہ ''امنگ'' مرے سامنے ہے۔آج 9 رمئی ہے اور ''مدرڈے'' کی مناسبت سے خصوصی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں لیکن ''وہی ڈھاک کے تین پات'' جنین کشی یعنی دختر کشی۔شرح اسقاط کے اعداد و شمار کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے سماج میں کتنا انحطاط ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں برطانیہ ہی کو لیں تو ہر روز کم سے کم 600 جنین کشی کے واقعے رونما ہوتے ہیں اور یہ تعداد سال میں دو لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔یہ وہ تعداد ہیں جو جنین بننے کے بعد واقع ہوتی ہیں ورنہ ابتدائی دور کے اسقاط کی تعداد بھی نہیں ملتی جو سماجی اسباب کی بنا پر ہوتے ہیں۔

"Lancet" کے تازہ شمارے کے مطابق

- دنیا میں 5 حمل میں سے ایک اور 3 میں سے ایک صرف یورپ میں اسقاط حمل ہوتا ہے۔
- دنیا کے 41.6 ملین اسقاط میں 35 ملین ترقی پذیر ملکوں میں اور 6.6 ملین ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتے ہیں۔
- دنیا کے 54 ممالک اسقاط کو قانونی اجازت دیتے ہیں جو دنیا کی آبادی کا 61 فیصد ہے۔
- 97 ملکوں میں جو آبادی کا 39 فیصد ہے وہاں اسقاط حمل غیر قانونی ہے۔
- دنیا بھر میں تقریباً 1,26,000 اسقاط ہر روز انجام پاتے ہیں۔

- Alan Guttmacher انسٹی ٹیوٹ کے سروے کے مطابق ہر سال امریکہ میں 1,370,000 اسقاط رونما ہوتے ہیں۔
- 88% اسقاط حمل کے 6 سے 12 ہفتہ کے درمیان ہوتے ہیں۔
- 47 فیصد معاملات ایسے ہیں جن میں اسقاط کم از کم ایک بار قبل بھی ہو چکا ہے۔
- زیادہ تر عورتیں کم عمری میں اسقاط کراتی ہیں جن میں سے 55 فیصد تو 26 سال سے کم کی ہوتی ہیں اور 21 فیصد نوخیز بچیاں (Teen Ager) ہوتی ہیں۔
- 51 فیصد عورتیں جو غیر شادی شدہ ہیں وہ اسقاط کراتی ہیں اور یہ تعداد شادی شدہ کے مقابلے چھ گنا زیادہ ہے۔
- 25.5% عورتیں اسقاط اس لیے کراتی ہیں کہ وہ ہر وقت حاملہ نہیں ہونا چاہتی ہیں۔
- 23.3% عورتیں بچوں کی نگہداشت اور پرورش نہیں کر سکتی ہیں۔
- 14 فیصد خانگی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب اسقاط کراتی ہیں۔
- 12.2% کم سن مائیں جو بے حد نوخیز ہیں انھیں اسقاط کرانا پڑتا ہے۔
- 10.8% عورتیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ حاملگی ان کی تعلیم یا ملازمت کو منقطع کر دے گی۔
- 7.9% عورتیں بچے نہیں چاہتی ہیں۔
- 3.3% عورتیں اسقاط اس لیے چاہتی ہیں کہ بچے کی صحت پر اثر نہ پڑ رہا ہو۔
- 2.8% عورتیں اسقاط اس لیے کراتی ہیں کہ ان کے ذہن پر اثر ہو رہا ہے۔

اسقاط حمل کے لیے ہرگز جنین کی جنس کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس وقت صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ حاملگی سے نجات ملے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک عورت کو حاملگی کے بعد سماجی دباؤ میں بالخصوص اپنے شوہر یا خانوادہ کے اصرار پر جنین کے جنس کی شناخت کے لیے ٹسٹ سے گزرنا پڑتا ہے جو آج کل بڑا ہی آسان ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم مادہ جنین کشی (Female Foeticide) کے متعلق گفتگو کریں ذرا ایک بیان کو بھی پڑھ لیں۔

''2005 میں 90 ملین عورتیں سات ایشائی ملکوں سے غائب ہیں جو ظاہراً جنسی انتخابی اسقاط حمل کا نتیجہ ہیں اور اس طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 2020 تک 25 ملین زائد نوجوان مرد (Surplus Male) صرف ہندوستان میں موجود ہوں گے۔''

ہندستانی پس منظر میں دیکھیں تو بچیاں صدیوں سے نہایت غیر محفوظ ہیں۔ اکثریت کو دیکھا جائے تو خواہ وہ نہایت تعلیم یافتہ، تہذیب یافتہ، دولت منداور روشن خیال ہوں عزت وشہرت کے مالک ہوں مگر ان کی نظر میں بٹی کی پیدائش فال نیک نہیں ہوتی۔

ہم نے بچپن سے تاریخ کے ان اوراق کو جب بھی پڑھا اور زمانہ جاہلیت کے رسم و رواج کے قصے سنے کہ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا تو ایک عجیب کیفیت سے گزرنا ہوتا تھا۔ وحشی اور درندہ انسانوں اور قوموں کے لیے نفرت اور حقارت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

حیاتیاتی قانون انسانی اور انسانی تخلیق جنس کا تناسب قائم رکھتے ہیں اور جنین کشی یا قتل نوزائیدہ نے ہندوستان اور چین کی آبادیوں کے تناسب کو بگاڑ دیا ہے۔

راجستھان کے بعض علاقوں میں تو صرف لڑکا ہی پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ بچیاں کہاں گئیں۔ نتیجے میں راجستھان مین ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے دلہنیں خریدی جاتی ہیں اور اس سودے میں ذات پات، سماجی رکھ رکھاؤ یا مذہبی ترجیحات بھی پیچھے رہ جاتی ہیں۔ پنجاب معاشی اور مالی اعتبار سے نہایت بافروغ صوبہ ہے لیکن پنجاب کا شہر لدھیانہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں سب سے کم جنسی تناسب ہے۔

تازہ ترین سروے کے مطابق 67 فیصد کاشتکار اور تقریباً آدھے غیر کاشتکاروں نے مادہ جنین کی طرفداری کی اور اکثریت نے کہا کہ وہ بچیوں کی پرورش میں کثیر رقم خرچ نہیں کر سکتے۔ خاندان میں ایک ہی بچی کافی ہوتی ہے۔

اسی طرح بھٹنڈا میں 32 فیصد کاشتکار گھرانے اور 48 فیصد غیر کاشتکاروں نے بھی مادہ جنین کشی کو مناسب ٹھہرایا۔

راجندر والیا کے 2005 کے سروے کے مطابق (Female Foeticide in Punjab) دونوں ہی خطوں میں نہ صرف مرد بلکہ عورتوں نے بھی اس بات کو قبول کیا کہ ہم اولاد چاہتے ہیں

اور پرورش بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ لڑکا ہو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مادہ جنین کشی ہی کیوں؟ تو دو ہی اسباب عام ہیں۔ پہلا معاشی اور دوسرا سماجی۔

زمانہ قدیم سے بچیوں کو بوجھ سمجھا جاتا رہا ہے۔ چونکہ اسے پال پوس کر بڑا کرنا پڑتا ہے اور نگہداشت کے بعد کسی مرد کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اس کا شوہر ہوتا ہے۔ جو مال و متاع اس کی پرورش اور نگہداشت میں خرچ ہوتا ہے اس کی تعلیم و تربیت پر جو بھی اخراجات آتے ہیں وہ بیکار اور بے سود ہوتے ہیں۔ اس کے صلہ میں کچھ حاصل نہیں ہوتا جو ایک فضول اور بے فائدہ Investment ہوتا ہے جس کا کوئی Return نہیں۔

مزید یہ کہ جب اسے بیاہنا ہوتا ہے تو جہیز میں گھر کا بیشتر اثاثہ بیٹی کے حوالے کر دینا پڑتا ہے جبکہ بیٹا بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے۔ وہ والدین کے آخری دم تک ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی پرورش، دیکھ ریکھ اور تعلیم و تربیت ایک نفع بخش عمل ہے مزید یہ کہ وہ دلہن کے ساتھ جہیز بھی لاتا ہے۔

یہ مادی ذہنیت ان تمام واقعات کے پیچھے ہوتی ہیں جہاں مادہ جنین کشی کا واقعہ سرزد ہوتا ہے۔ خواہ وہ تاریخ ماضی کا واقعہ ہو یا حال کا روشن خیالی کا زمانہ۔ ہر انسان شقی القلب اور سنگ دل نہیں کہ جنے بچے کو جو سانس لے رہا ہو اسے زمین کے نیچے دبا دے، خنجر مار کر قتل کر دے، ندی نالوں میں پھینک دے۔ آج کا زمانہ سائنس کا زمانہ ہے۔ نئی تکنیک اسے ان الجھنوں سے آزاد کرانے میں معاون ہے۔ چند سکّے چند نوٹ خرچ ہوتے ہیں تاکہ جنین رحم ہی میں معلوم ہو جائے اور اگر مادہ ہے تو وقت سے پہلے ہی چھٹکارا پا لیا جائے تاکہ بعد میں احساس پشیمانی بھی نہ رہے۔

سائنسی ایجادات تو آسانیوں اور ترقیات کے لیے ہوتی ہیں اس سے اس شعبے میں سہولیات پیدا ہوئی ہیں۔ الٹراساؤنڈ کی ایجاد بھی ایسے ٹسٹ کے لیے تھی جس میں رحم کے اندر موجود جنین کے عیوب کا پتہ لگایا جائے مگر ہم نے اُسے جنین کے جنس کی شناخت کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

آج کے دور میں Aminocentesis اور Ultrasonography سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ناجائز استعمال ہوتی ہے۔

گزشتہ 25 سالوں میں الٹرا ساؤنڈ کی فراہمی کے بعد کروڑوں بچیوں کو اس دنیا میں آنے سے روک دیا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف پس پردہ یہ جرائم پنپ رہے ہیں تو دوسری طرف قانون بھی بن رہے ہیں اور ان کا مذاق بھی بن رہا ہے۔

ہم سبھی جانتے ہیں کہ قانون جنسی انتخاب جنین قابل سزا جرم ہے اور 3 سے 5 سال تک حوالات میں بھیجا جا سکتا ہے اور دس سے پچاس ہزار جرمانہ بھی ہو سکتا ہے۔

1994 میں Preconception and Prental Diagnostic Technique Act, 1994 (PNDT Act 1994) قانون بنا اور بار بار ترمیم کر کے سخت تر بنایا گیا خصوصاً طبی پیشہ سے منسلک لوگوں کے لیے زیادہ سختی برتی گئی لیکن افسوس ہے کہ سزایابی (Conviction) بہت دور اور شاید ناپید ہی ہے۔

انصاف میں تاخیر اور التوا جرم کو اور بڑھاتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ PNDT Act جنین کی شناخت کے لیے باضابطہ ایک بورڈ ہوتا ہے جسے مندرجہ ذیل شرائط میں سے کم از کم ایک کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

- خاتون کی عمر 35 سے زائد ہو۔
- حاملہ کم از کم دو بار قبل بھی اچانک ہونے والے اسقاط سے گزر چکی ہو۔
- خاتون یا اس کے شوہر کو کوئی جینی مرض، جسمانی یا ذہنی بدنمائی ہو۔
- کوئی نقصان دہ دوا، ڈیڈیشن، عفونت یا کیمیائی مادہ کا استعمال کیا ہو یا کوئی ایسی خاص بات جو بورڈ کی توجہ میں لانا ضروری ہو۔

مگر ہر صورت میں جنین کے جنس کی شناخت صیغۂ راز میں رکھنا ہوگا۔ یہ تمام مسائل مکتوب ہونے چاہیے اور تمام کاغذات پوشیدہ رکھنا ہوگا۔

اگر چہ ایکٹ کوئی کسر نہیں چھوڑتا پر اس کا عمل میں لانا ایک مہم ہے۔ بڑی دلچسپ بات

یہ ہے کہ الٹرا ساؤنڈ میں 300 سے 500 روپے کا خرچ آتا ہے لیکن جنس کی شناخت کے لیے 1000 سے 5000 مانگ لیا جاتا ہے۔ اگر بچہ ہے تو فیس اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

سخت سے سخت تر قانون کے باوجود جسے بنانے والے اور عوام بھی جانتے ہیں کہ لڑکے اور لڑکیوں کا تناسب تیزی سے گر رہا ہے جسے 2001 کے مردم شماری میں دیکھا گیا اور اب 2011 کی مردم شماری میں کچھ اور دیکھنے کو ملے گا۔

1961 سے 2001 تک لگاتار کمی آتی گئی۔ 1961 میں فی ہزار لڑکوں کی تعداد میں 945 لڑکیاں تھیں جو کم ہو کر 2001 میں 927 رہ گئیں۔ پنجاب میں 793، ہریانہ میں 820، ہماچل میں 897 اور گجرات میں 874 پائی گئیں۔ اگر حالات ایسے رہے تو سماج کا سارا ڈھانچہ بگڑ جائے گا۔ اخلاقی معیار پستی کی طرف جا رہا ہے اور یہ خطرہ سارے ملک کے لیے بن گیا ہے۔ آئے دن اخباروں میں خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

جنسی شناخت، جنسی انتخاب اور انتخاب کے بعد منتخب جنس کا اسقاط کچھ ایسے مسائل ہماری سوسائٹی میں جگہ بناتے جا رہے ہیں جن سے نبرد آزمائی ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ اسپتالوں، نرسنگ ہومز، کلینک کے آس پاس گڈھوں میں، کوڑے دانوں میں، پالی تھین کی تھیلیوں میں اپنی سوسائٹی کے نشانات ہم دفن کیے دے رہے ہیں۔ یہ کہانی نہ صرف دیہاتوں، قصبوں، چھوٹے شہروں کی ہے بلکہ انتہا تو یہ ہے کہ ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی تک میں یہ عام ہے۔

ماہرین کا ماننا ہے کہ ہم لڑکوں یا مردوں کی کثیر تعداد والی سوسائٹی تیار کر رہے ہیں جہاں عورتوں کے خلاف تشدد اور جرائم میں اضافہ ہوگا۔

جہیز کی وجہ سے اموات، کم سنی میں شادی، دلہنوں کے بیچنے، یرغمال اور زنا میں اضافہ ہوگا اور ایسے میں چند شوئی (Polyandry) میں بھی اضافہ ہوگا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مادہ جنین کشی قدیم ستی کے رواج سے بھی زیادہ ظالمانہ عمل ہے۔ جب ستی کو روکا جا سکتا ہے تو رجائیت پسند لوگوں اور امید پر رہنے والوں کے مطابق سماج کی اس برائی پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے بشرطیکہ محکم ارادہ ہو اور سماج کے تمام طبقوں کا تعاون حاصل ہو۔

جب بھی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں تو انگلی اطبا کی طرف اٹھتی ہے جو اپنے پیشے کی عفت و پاکیزگی کو رسوا کرتے ہیں مگر بھلا یہ تو غور کریں کہ اطبا تک اس کام کے لیے کون پہنچتا ہے۔ وہ ماں جس کی کوکھ میں بچی پل رہی ہوتی ہے۔ وہ والدین، وہ لواحقین جوان ارادوں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ یعنی دونوں ہی اس جُرم میں شریک ہوتے ہیں۔

ہمارا سماج معاشی یا سماجی دباؤ میں آ کر جنینی شناخت کے بعد اسقاط حمل کے فیصلے تو لے لیتا ہے مگر اس کے دوسرے رُخ سے اکثر ناآشنا ہے۔ اسقاط کے بعد حاملہ کے جسم کو کتنا نقصان پہنچتا ہے کم لوگ اس پر غور کرتے ہیں۔

اسقاط حمل کی وجہ سے جسمانی اور ذہنی بیماریاں اکثر ہو جاتی ہیں جو تادم حیات پلتی رہتی ہیں۔ ایک نظر بہتر ہے اس پر بھی ڈال لیں۔

1۔ موت:

اسقاط سے متعلق اموات میں شدید خونریزی، عفونت، انجماد خون، جنین کا غلط جگہ پنپنا (Ectopic Pregnancies)۔

2۔ سرطان پستان:

پستان کے سرطان کا خطرہ ایک اسقاط کے بعد دوگنا ہو جاتا ہے اور اگر زیادہ بار اسقاط ہوا ہے تو اور بھی خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

3۔ رحم میں سوراخ ہو جانا:

دو سے تین فی صد خطرات اسقاط میں بڑھ جاتے ہیں۔

4۔ گردن رحم، بیضہ اور جگر کا کینسر:

اسقاط حمل کے بعد سوائیکل، اووری اور جگر کے سرطان کا خطرہ کئی گنا ہو جاتا ہے۔

5۔ گردن رحم کے زخم میں جراحت (Laceration):

6۔ جریان خون آنول:

اسقاط کے بعد کی حاملگی میں Placenta Praevia کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

7۔ معذور بچوں کی پیدائش:

اسقاطِ حمل کے بار بار ہونے کے بعد حمل میں معذور بچے ہونے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔

8۔ جنین کا غلط جگہ قائم ہونا(Ectopic Pregnancies):

9۔ پیڑو میں ورم آور بیماریاں(Pelvic Inflamatory Diseases):

10۔ درونِ رحمہ (Endometriosis):

اسلامی نقطۂ نظر:

لڑکیوں کے قتل کے پیچھے دورِ جاہلیت کی ذہنیت کام کر رہی ہے۔ بعثتِ نبوی کے بعد لڑکیوں کو زندہ درگزر کیے جانے کا سلسلہ بند ہوا اور نہ عربوں کے لیے عورت کا وجود خاندان کے لیے باعث ننگ تھا۔ اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں اگر کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تو اُس معصوم کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا کیونکہ وہ بیٹی کی پیدائش کو اپنے لیے عیب سمجھتا تھا۔ قرآن پاک میں عربوں کی اس جاہلی ذہنیت کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں اشارہ کیا گیا ہے: ج

"وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝
يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ
اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ"

''اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اُس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ زہر سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خبر سے جو شرم کا داغ اس کو لگ گیا ہے اس کے باعث لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہوں یا مٹی میں دبا دوں۔'' (سورۃ النحل، آیت:59-58)

حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد سے پہلے عورتوں کی کیسی بدتر حالت تھی۔ انھیں دنیا میں جینے کا حق نہیں تھا۔ ان کی حیثیت زر خرید باندی سے بھی کم تھی۔ انھیں دوزخ کا کندہ سمجھا جاتا تھا۔ انھیں قربان گاہوں میں دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا، لیکن حضور اقدس تشریف لائے تو آپ ﷺ نے عورتوں کی مظلومیت کو ختم کیا اور بہ بانگِ دہل دنیا والوں سے کہا کہ عورت

بھی اللہ تعالیٰ کی ایسی ہی مخلوق ہے جیسے مرد، زندگی کے میدان میں اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو مرد کی اور اللہ کی طرف سے اس کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو ایک مرد کو۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً کَثِیْراً."

("لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔") (سورۃ النساء، آیت:1)

اور دوسری جگہ فرمایا:

"وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ."

("عورتوں کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرو۔")(سورۃ النساء، آیت:19)

مزید فرمایا:

"هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ."

"وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے۔"(سورۃ بقرہ، آیت:187)

حضور ﷺ کی تعلیمات کے نتیجہ میں بھی مسلم معاشرہ میں خواتین کو جو عزت و احترام ملا تھا، اس کی مثال نہیں ملتی لیکن غیر اسلامی معاشروں کے اثرات اور اسلامی احکامات کی غلط تاویلات کے نتیجہ میں مسلم معاشرہ میں بھی مسلم لڑکیوں کے بارے میں غلط تصورات آہستہ آہستہ در آئے ہیں چونکہ ابھی اسلامی تعلیمات کے اثرات کی گرفت اتنی کمزور نہیں ہوئی کہ اس گھناونے فعل کو قبول عام کی سند حاصل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی مسلم معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کے تناسب میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

OOO

طفل کشی

(Infanticide)

طفل کشی (Infanticide) پر بھی معلومات ضروری ہو جاتی ہیں چونکہ جنین کشی عام طور پر پڑھے لکھے گھرانوں یا معمولی گھرانوں میں ہی مروج ہے اور قصبوں دیہاتوں اور دور دراز علاقوں میں عام نہیں۔ چونکہ ان علاقوں میں طبی سہولیات کا فقدان ہوتا ہے لیکن طفل کشی آج کے دور میں بھی عام نہیں تو شاذ و نادر بھی نہیں۔

طفل کشی بھی دختر کشی سے موسوم ہو جاتی ہے جبکہ ایسا حقیقتاً نہیں۔ سائنسی ایجادات نے جنین کشی کو آسان بنا دیا ہے اور قبل ولادت ہی غیر مطلوبہ حمل (Unwanted Pregnancy) سے نجات کا طریقہ آسان ہو گیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اگر یہ طریقہ نکل آتا تو غیر مہذب عرب بھی اسے اپناتے اور انھیں زندہ لڑکیوں کو دفن نہ کرنا پڑتا۔

جنین کشی کے باوجود طفل کشی آج بھی عام ہے اور مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ اسباب خواہ فقر و فاقہ، غربت و تنگی، اولاد کی کثرت ہو یا کوئی اور سبب ہو مگر عام طور پر آج بھی طفل کشی کے بجائے دختر کشی ہی سمجھا جاتا ہے اور واویلا دختر کشی کا ہی ہوتا ہے۔

طفل کشی دراصل قصداً بچے کو قتل کرنا کہلاتا ہے اور عام طور پر مائیں ہی اس عمل کو انجام

دیتی ہیں لیکن ماہرین جرائم دوسرے اسباب اور طریقے بتاتے ہیں۔ طفل کشی آج کے دور یا ماضی قریب کی باتیں اور قصے کہانیاں نہیں بلکہ اگر تاریخ کے اوراق کو پلٹیں تو زمانہ قدیم حتیٰ کہ پتھروں کے زمانے سے مروج ہے۔ یہ ضرور ہے کہ دختر کشی کے مقابلہ پسر کشی کم رہی ہے۔

طفل کشی مختلف ممالک میں مختلف قانونی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستان میں طفل کشی کی تعریف ''غیر قانونی طور پر نوزائیدہ کو ماردینا جسے قانوناً قتل مانا جاتا ہے'' اور اس کی سزا دفعہ IPC203 کے مطابق قتل، قید تا حیات اور جرمانہ ہے۔ لیکن یہ عام قتل سے بالکل مختلف ہے چونکہ یہ ثابت ہونا ضروری ہے کہ بچہ زندہ پیدا ہوا تھا۔ نوزائیدہ اس ایکٹ کے مطابق زندگی کے پہلے سال میں تھا لیکن اکثر بچے پیدائش کے فوراً بعد قتل کردیے جاتے ہیں۔

طفل کشی کا ارتکاب زیادہ تر غیر شادی شدہ عورتوں اور کبھی کبھی شادی شدہ عورتوں کے ذریعہ بھی عمل میں آتا ہے۔ ہندستانی معاشرے میں جہاں جہیز کی لعنت عام ہے دختر کشی بھی عام ہے مگر طوائفوں اور جنسی پیشہ ورعورتوں کے یہاں پسر کشی عام ہے۔

طفل کشی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو دیکھتے ہیں کہ بچوں کی قربانی بعد القدرت طاقتوں جیسے قدیم Carthage میں ہوا کرتا تھا اور یہ قربانیاں عجوبہ نہیں بلکہ عام بات تھیں۔

ماہر انسانیات اور ماہر بشریات ''لیلیٰ ولیم'' کے مطابق تقریباً تمام براعظم میں طفل کشی عام تھی جو شاید جنگلی وحشی زمانہ سے اب کے نہایت مہذب دور تک رائج ہے۔

یہ ضروری نہیں تھا کہ غیر مطلوبہ بچوں کا قتل ہی کیا جائے بلکہ عام طور پر طفل کشی کے لیے قدیم یورپ اور ایشیا میں بچوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ شدید سردی، بھوک، پیاس سے مرجائیں یا کوئی درندہ اور آدم خود جانور انھیں لقمہ اجل بنالے۔ آج کے جدید اور ترقی یافتہ دور میں بھی اکثر اخباروں میں ایسے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں کہ کوڑوں کے ڈھیر پر یا اسپتال کے زینوں پر ماں یا والدین بچے کو چھوڑ جاتے ہیں یا پھر زہر دے کر یا گلا گھونٹ کر مار دیتے ہیں۔

زمانہ قدیم میں طفل کشی کا سلسلہ Paleolithic اور Neolithic یعنی شروع سے آخری دو حجر یعنی پتھروں کے زمانہ میں بھی تعداد افراد کے بڑھنے کو روکنے کے لیے جاری تھا تاکہ

محدود ذرائع اور پیداوار میں آبادی کے اضافہ سے پریشانیاں پیدا نہ ہوں۔

ماہرین نے 15 فیصد سے 5 فیصد کل ولادت کی طفل کشی کا ذکر کیا ہے۔ طفل کشی کا یہ دور زمانہ زراعت و کاشتکاری تک چلتا رہا۔ اتفاق یہ ہے کہ ان میں 50 فیصد بچیاں ہی اس کا شکار ہوتی تھیں اور یہ کام ان کے والدین ہی انجام دیتے تھے۔

قدیم تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بچوں کی قربانیاں غیبی طاقتوں کو خوش کرنے کے لیے بھی دی جاتی تھیں اور آج بھی اکا دکا بلی چڑھانے کا واقعہ گاہے بہ گاہے سننے میں آجاتا ہے۔ Sardinia میں تین ہزار بچوں کی ہڈیاں پائی گئی تھیں جو Babylonian دیوتا Ishtar کی نذر کی گئی تھیں۔ Pelasgian تو مشکلات میں اپنے ہر دسویں بچے کو بلی چڑھا دیتے تھے۔ اسی طرح شام یعنی Syria میں بچوں کو Jupiter اور Juno کی نذر کیا جاتا تھا۔ مصر میں بھی 720-950 قبل مسیح یہی عالم تھا۔ کئی اور قدیم تہذیبوں میں بھی یہ رواج عام تھا بلکہ ان کے یہاں بچے کو ان کے خداؤں کے سامنے قربان کیا جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ یہ رسم ختم ہوتی گئی اور اسی مصر میں خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی اسے قیمتی سمجھا جانے لگا اور قدیم مصری مذاہب میں طفل کشی ممنوع قرار پائی اور Greeco-Roman زمانہ میں لاتعداد بچوں کو گوبر کے ڈھیر سے اٹھا کر محفوظ کیا جاتا رہا۔ بے باپ ماں کے بچوں کی پرورش غلاموں کی طرح کی جاتی تھی اور اکثر ان کا نام "Copro" دیا جاتا تھا تا کہ ان کی شناخت ہو سکے اور انھیں بچایا جا سکے۔ بعض حکمرانوں نے طفل کشی کو قابل جرم قرار دیا ہے۔ مصر میں کاشتکاری کے لیے دریائے نیل میں سیلاب کا انتظار ہوتا تھا اور اکثر قحط سالی بھی دیکھنی پڑتی تھی۔ ایسے موقع پر بھی طفل کشی کے واقعے ہوتے تھے۔

روم کی تاریخ میں ایسا بھی زمانہ گزرا ہے کہ نوزائیدہ کو Pater Familias جو Patriarch خاندان کہا جاتا تھا کے پاس لایا جاتا اور نوزائیدہ کا مقدر وہیں طے پاتا تھا کہ بچے کی پرورش کی جائے یا اسے آوارہ چھوڑ دیا جائے۔

اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نمایاں اپاہج یا عیب دار بچوں کو قتل کر دیا جاتا تھا لیکن 774 بعد مسیح طفل کشی ایک جرم مانا جانے لگا۔

دیومالائی یا اساطیر الاولین زمانے میں Romulus اور Remus دو جڑواں بچے

مارس، خدائے جنگ کے ہوئے جنھیں Tiber ندی میں پھینک دیا گیا لیکن ان کی پرورش بھیڑیوں نے کی اور جب وہ بڑے ہوئے تو شہر روم بسایا۔ طفل کشی نہ صرف روم مصر کے قصے اور عربوں کا سفاکانہ حکایتیں رہیں بلکہ ایشیا اور روس کے ممالک بھی پیچھے نہیں رہے۔

روس میں ملیدین اس وقت کے خدائے Perum کی خدمت میں اپنے نونہالوں کو بلی چڑھا دیتے تھے۔ گاؤں کے لوگ اپنے بچوں کو سور کے سامنے پھینک دیتے تھے۔

Svans بچوں کے منہ کو آگ اور راکھ سے بھر دیتے تھے۔ Kamchatka بچے مارنے کے بعد کتوں کے سامنے پھینک دیے جاتے تھے۔

سائبیریا میں تو ابھی انیسویں صدی میں بھی طفل کشی مروج تھا اور جڑواں بچوں میں سے کم از کم ایک کو قربان کر دیا جاتا تھا۔

چین میں تیسری صدی قبل مسیح میں قانون تھا کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو مبارک باد دی جائے اور اگر بچی ہو تو قتل کر دیا جائے۔ وہاں کے کئی معروف قبیلوں میں نہایت سرد پانی ڈال دینے کا رواج تھا جس عمل کو Baby Water کہا جاتا تھا۔

جاپان میں طفل کشی کے لیے Mabiki اصطلاح استعمال ہوتی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ گھنے باغ سے پودا کھینچ لو۔ اور جاپان میں طفل کشی کا طریقہ یہ تھا کہ بچے کے منہ اور ناک کو جم کاغذ سے ڈھک دیا جائے اور یہ طریقہ بیسویں صدی تک مروج رہا۔

ہندوستان میں قرون وسطیٰ میں راجپوت ناجائز اولاد کو ایک ہاتھ میں اٹھا لیتے اور دوسرے ہاتھ میں خنجر ہوتا اور اعلان کیا جاتا کہ اگر کوئی بیوی چاہتا ہے تو لے جائے ورنہ فوراً قتل کر دیا جاتا۔

بچیوں کو قتل کرنے کا رواج کچھ، کھتری، ناگر، گجرات وغیرہ میں اور سندھ میں عام تھا۔ بچوں کو گنگا ندی میں پھینک دیا جاتا جہاں شارک مچھلیاں انھیں کھا جاتی تھیں۔

افریقہ میں بھی بچوں کو اس خوف سے قتل کیا جاتا رہا کہ وہ بری ارواح نہ ہوں۔ جڑواں تو اکثر مار دیے جاتے تھے۔ نائیجیریا میں IBO لوگ بچہ جنتے وقت اگر ماں مرجاتی تو بچے کو زندہ گاڑ دیتے تھے اور باپ بھی کسی وجہ سے مرجاتا تو یہی کیا جاتا تھا۔

برازیل میں بعض قبیلے تین بچوں کے علاوہ چوتھے کے حق میں نہ تھے ان میں بھی کم از کم دولڑ کے ہوں یا دولڑکیاں ہوں۔ اگر یہ قانون کسی نے توڑا تو زائد بچے کا قتل ہوتا تھا۔ وہیں Boro قبیلے میں اگر نوزائیدہ صحت مند نہ ہوتا تو اسے ماردیا جاتا۔

آج بھی طفل کشی نہایت غریب علاقوں میں اور گھنی آبادی خاص کر چین و ہندوستان میں عام ہے خاص کر اگر بچی ہو تو وہ زیادہ خطرے میں ہے۔

قدیم تاریخ کے ان اوراق کو پلٹنے کے بعد معروف مذاہب کا بھی ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

یہودیوں کے یہاں طفل کشی جرم مانا گیا گرچہ قدیم Hebrews میں بچوں کی قربانی خدائے Heathen کے لیے دی جاتی رہی ہے۔

یہی نہیں نوزائیدہ کو آگ میں بھی ڈال دیا جاتا تھا لیکن بعد میں Mosaic قانون کے مطابق Molach کے بنا سامنے اس طرح کی قربانی ممنوع قرار دی گئی۔

عیسائیوں نے بھی طفل کشی کو نامنظور قرار دیا۔ Apostle کا حکم جاری ہوا جس میں اعلان کیا گیا کہ جو پیدا ہو گیا اسے مارا نہیں جاسکتا۔ اسی قسم کا حکم نامہ برناباس نے بھی دیا۔

318 بعد مسیح طفل کشی جرم قرار دیا گیا اور 374 بعد مسیح Valentine-I نے ہر بچے کی پرورش کا حکم جاری کیا۔ اسپین میں اپنے ہی بچوں کو قتل کرنا ایک رسم تھا جو 589 بعد مسیح ختم ہوا۔

قرون وسطیٰ میں بھی باوجودیکہ وعظ و نصیحت جاری تھی بچوں کو آوارہ چھوڑ دینا جاری رہا حتیٰ کہ بارھویں صدی تک رومی خواتین اپنے بچوں کو Tiber ندی میں پھینک دیتی تھیں۔ بچوں کو چرچ کے دروازے پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور پادری ایسے بچوں کو پالنے پر مجبور تھے اور یہ اتنا عام ہوا کہ پہلا یتیم خانہ وجود میں آیا۔

عربوں کے یہاں تو طفل کشی قبل اسلام اس قدر عام تھی کہ اسے ''بعد ولادت برتھ کنٹرول'' کہا جانے لگا۔ اور یہ اتنا عام ہوا کہ اس کے لیے مخصوص اصطلاح ''وعد'' استعمال کی گئی اور یہ قربانیاں عام طور پر خداؤں کے لیے ہوتی تھیں۔ بیٹی کی پیدائش سماجی ذلت کا باعث تھی۔

بنو تمیم خشک سالی میں اپنی اولادوں کو قربان کر دیتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج قبل اسلام تاریخ میں ایک بدنما صفحہ ہے۔

نزول قرآن کے بعد رفتہ رفتہ یہ رسم ختم ہوئی۔ طفل کشی اسلام میں اس قدر ناپسندیدہ عمل مانا گیا کہ بار بار باری تعالیٰ نے کلام الٰہی میں اس کا ذکر کیا ہے:

"وَإِذْ نَجَّيْنَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ."

("اور جب ہم نے تمھیں فرعونیوں سے نجات دی جو تمھیں بدترین عذاب دیتے تھے جو تمھارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے اور تمھاری لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے، اس نجات دینے میں تمھارے رب کی بڑی مہربانی تھی۔")
(البقرہ، آیت:49)

("اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے بچالیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ تمھارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمھارے پروردگار کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی۔" (الاعراف، آیت:141)

"وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنجَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ."

("جس وقت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کے وہ احسانات یاد کرو جو اس نے تم پر کیے ہیں جب کہ اس نے تمھیں فرعونیوں سے نجات دی جو تمھیں بڑے دکھ پہنچاتے تھے۔ تمھارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے اور تمھاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑتے تھے، اس میں تمھارے رب کی طرف سے تم پر بہت بڑی آزمائش تھی۔") (ابراھیم، آیت:6)

"إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ."

(''یقیناً فرعون نے زمین میں سرکشی کر رکھی تھی اور وہاں کے لوگوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا اور ان میں سے ایک فرقہ کو کمزور کر رکھا تھا اور ان کے لڑکوں کو تو ذبح کر ڈالتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بیشک وشبہ وہ تھا ہی مفسدوں میں سے۔'') (القصص، آیت:4)

فرعون، نجومیوں کی پیشن گوئی کے مطابق، بادشاہت خطرے میں نہ پڑ جائے بچوں کو ذبح کر دیتا تھا۔ جب موسیٰ دین حق لے کر پہنچے تو اس کی تذلیل واہانت کے لیے دوبارہ حکم دیا، تا کہ بنی اسرائیل موسیٰ کے وجود کو اپنے لیے مصیبت اور نحوست کا باعث سمجھیں۔

''فَلَمَّا جَآءَ هُم بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَ هُمْ ط وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ''

(''پس جب ان کے پاس موسیٰ ہماری طرف دین حق لے کر آئے تو انھوں نے کہا کہ اس کے ساتھ جو ایمان والے ہیں ان کے لڑکوں کو مار ڈالو اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھو اور کافروں کی جو حیلہ سازی ہے وہ غلطی میں ہی ہے۔'' (المومن، آیت:25)

''وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ط قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَ هُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَ هُمْ ج وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ''

(''اور قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰ اور ان کی قوم کو یوں ہی رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں اور وہ آپ کو اور آپ کے معبودوں کو ترک کیے رہیں۔ فرعون نے کہا کہ ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے اور عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے اور ہم کو ان پر ہر طرح کا زور ہے۔'' (الاعراف، آیت:127)

قتل کا پروگرام فرعونیوں کے کہنے سے بنایا گیا۔ اس سے قبل بھی، جب موسیٰ کی ولادت نہیں ہوئی تھی، موسیٰ کے بعد از ولادت خاتمے کے لیے اس نے بنی اسرائیل کے نومولود

بچوں کو قتل کرنا شروع کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی ولادت کے بعد ان کو بچانے کی یہ تدبیر کی کہ موسیٰ کو خود فرعون کے محل میں پہنچا کر اسی کی گود میں ان کی پرورش کرائی۔

اسلام میں قتل اطفال بہت بڑا گناہ مانا گیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

"وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ."

("......اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کرو۔ ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں۔") (الانعام، آیت:151)

دوسری جگہ فرمایا:

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئاً وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ."

("اے پیغمبر! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گی جو خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیں اور کسی نیک کام میں تیری بے حکمی نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت کر لیا کریں۔ اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے اور معاف کرنے والا ہے۔")

(الممتحنہ، آیت:12)

OOO

مادہ طفل کشی

(Female Infanticide)

باتیں طفل کشی (Infanticide) کی ہورہی تھیں جس میں ہم لوگوں نے اس بات کو
جانا کہ طفل کشی آج کے دور یا ماضی قریب کی کہانیاں اور قصے نہیں بلکہ زمانہ قدیم حتیٰ کہ پتھروں کے
زمانے سے مروج رہی ہے۔ ہم نے یہ بھی جانا کہ کن حالات میں اور کن اسباب کے بنا پر یہ عمل
ہوتا رہا ہے۔ کبھی غیبی طاقت کو خوش کرنے کے لیے بچوں کی قربانیاں دی گئیں کبھی قدیم تہذیبوں
میں ان کے خداؤں کے سامنے بلی چڑھانے کا رواج کبھی عیب دار بچوں کو بہ جذبۂ رحم، کبھی
جڑواں میں سے کسی ایک کو، کبھی آبادی کم کرنے، کبھی خشک سالی سے نجات پانے کے لیے اور کبھی
فرعونیوں کا ظلم واستبداد جس کا قرآن کریم میں مختلف مقام پر ذکر آیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی اپنے نیک بندوں اور نبیوں کا امتحان لیا ہے۔

"فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي
أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَى قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي
إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ. فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ.
وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ. قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي

بچوں کو قتل کرنا شروع کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی ولادت کے بعد ان کو بچانے کی یہ تدبیر کی کہ موسیٰ کو خود فرعون کے محل میں پہنچا کر اسی کی گود میں ان کی پرورش کرائی۔

اسلام میں قتل اطفال بہت بڑا گناہ مانا گیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

"وَلاَ تَقْتُلُواْ أَوْلاَدَكُم مِّنْ إمْلاَقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُم."

("......اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کرو۔ ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں۔") (الانعام، آیت: 151)

دوسری جگہ فرمایا:

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئاً وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ."

("اے پیغمبر! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گی جو خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیں اور کسی نیک کام میں تیری بے حکمی نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت کر لیا کریں۔ اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے اور معاف کرنے والا ہے۔")

(الممتحنہ، آیت: 12)

ooo

مادہ طفل کشی

(Female Infanticide)

باتیں طفل کشی (Infanticide) کی ہو رہی تھیں جس میں ہم لوگوں نے اس بات کو جانا کہ طفل کشی آج کے دور یا ماضی قریب کی کہانیاں اور قصے نہیں بلکہ زمانہ قدیم حتیٰ کہ پتھروں کے زمانے سے مروج رہی ہے۔ ہم نے یہ بھی جانا کہ کن حالات میں اور کن اسباب کے بنا پر یہ عمل ہوتا رہا ہے۔ کبھی غیبی طاقت کو خوش کرنے کے لیے بچوں کی قربانیاں دی گئیں کبھی قدیم تہذیبوں میں ان کے خداؤں کے سامنے بلی چڑھانے کا رواج کبھی عیب دار بچوں کو بہ جذبۂ رحم، کبھی جڑواں میں سے کسی ایک کو، کبھی آبادی کم کرنے، کبھی خشک سالی سے نجات پانے کے لیے اور کبھی فرعونیوں کا ظلم و استبداد جس کا قرآن کریم میں مختلف مقام پر ذکر آیا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھی اپنے نیک بندوں اور نبیوں کا امتحان لیا ہے۔

"فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّيْ أَرَى فِيْ الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَى قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ. فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِيْنِ. وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيْمُ. قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِيْ

الْمُحْسِنِيْنَ . إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِيْنُ . وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ . وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ. سَلَامٌ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ . كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ . إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ. "

(''پھر جب وہ (بچہ) اتنی عمر کو پہنچا کہ اس کے ساتھ چلے پھرے، تو اس (ابراہیم) نے کہا میرے پیارے بچے! میں خواب میں اپنے آپ کو تجھے ذبح کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اب تو بتا کہ تیری کیا رائے ہے؟

بیٹے نے جواب دیا کہ ابا! جو حکم ہوا ہے اسے بجا لایئے انشا اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ غرض جب دونوں مطیع ہو گئے اور اس نے (باپ نے) اس کو (بیٹے کو) پیشانی کے بل گرا دیا۔

تو ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم!

یقیناً تو نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا، بیشک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ کھلا امتحان تھا۔ اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے فدیہ میں دے دیا۔ اور ہم نے ان کا ذکر خیر پچھلوں میں باقی رکھا۔ ابراہیم پر سلام ہو۔ ہم نیکوں کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھا۔'') (الصّفّٰت:102-111)

اس سنت ابراہیمی کو قیامت تک قرب الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ اور عیدالاضحیٰ کا سب سے پسندیدہ عمل قرار دیا گیا۔

طفل کشی میں ہر زمانہ میں لڑکیاں زیادہ متاثر ہوئیں ہیں۔ آج بھی اس جدید دور میں لڑکیاں ہی اکثر شکار ہوتی ہیں۔ خواہ وہ پیدائش کے بعد کا واقعہ ہو یا بڑی عمر کو پہنچ جانے کا۔

کبھی کثرت اولاد، فقر و فاقہ، غربت و تنگی، محتاجی، کم مائیگی، کبھی شادی بیاہ میں دشواریاں اور کبھی لالچی گھرانے میں پہنچ جانے پر جہیز کی خاطر۔ اگر صورت حال کا جائزہ لیں تو اسباب معاشی ہی نظر آتے ہیں۔

تاریخ میں عورتیں ہر دور میں محرومی، حرماں نصیبی، ناروا امتیاز، خوف و ہراس اور غیر منصفانہ رویہ کا شکار رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رویے اور طریقے ہر تہذیب میں اور ہر زمانے میں مختلف رہے ہیں۔

عورتیں سدا کمتر، دوئم درجہ، مردوں کے مقابلے مغلوب، محکوم، جسمانی اذیت اور بنیادی حقوق سے محروم رہی ہیں۔

تاریخ کے اوراق پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ زمانہ قدیم میں عورتوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے گئے۔ اس وقت مرد کو عورت پر کلی اختیارات تھے۔ اور اس کے یہ اختیارات صرف بیوی تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ ہر عورت کو مرد کی تابعداری اور اس کا حکم ماننا ضروری تھا کیونکہ یہ تصور عام تھا کہ وہ حاکم ہے اور عورت اس کی محکوم ہے اس کی ملکیت ہے۔ کسی کام میں بھی اس کو بولنے اور اپنی رائے دینے کا اختیار نہیں تھا۔

اس کے علاوہ سماجی حیثیت سے بھی اس کی حالت بہت پست تھی۔ ضرورت پڑنے پر اسے مہاجن کے یہاں رہن رکھا جاسکتا تھا حتیٰ کہ گھر کے لوگوں کو اس کی قربانی کا بھی حق تھا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ جب عورت کی نجات صرف شوہر کی تابعداری میں تھی۔ شوہر چاہے کتنی بھی سختی کرتا لیکن عورت کو سب کچھ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ یہ کسی ایک ملک یا کسی ایک قوم کی بات نہیں بلکہ روئے زمین کے ہر خطے اور ہر قوم کی یہی کیفیت تھی۔ رومۃ الکبریٰ جو اپنی تہذیب وتمدن کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے وہاں عورتوں کو شیطان کا آلۂ کار کہا جاتا تھا، اس کی گواہی قابل قبول نہیں تھی۔ اس کے ساتھ جانوروں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔

یورپ جس کی ظاہری شان وشوکت سے آج ہر شخص مرعوب ہے وہاں اس سے پہلے عورت کی کچھ قدر و قیمت نہ تھی۔ سولھویں صدی تک بے بنیاد الزام لگا کر عورتوں کو زندہ آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ لانگ پارلیمنٹ کے زمانے میں لاکھوں عورتیں صلیب پر چڑھائی گئی تھیں۔

خود ہندوستان میں عورت کو عقل سے عاری مانا جاتا تھا، وراثت سے وہ قطعاً محروم تھی۔ شادی کے بعد وہ شوہر کی ملکیت مانی جاتی تھی۔ شوہر کو قانوناً اس بات کا حق تھا جب چاہے عورت کو قتل کردے۔ شوہر کی موت کے بعد اس کو اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ چتا میں جلنا پڑتا تھا۔ اکثر اس کو جوئے کے داؤ پر لگا دیا جاتا تھا اور کوئی اس کا پُرسان حال نہ تھا۔

عرب کی اس سے بھی خراب حالت تھی۔ وہاں عورت کا وجود خاندان کے لیے باعث ننگ تھا۔ اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں اگر کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تو اس معصوم کو زندہ دفن

کردیا جاتا تھا کیونکہ وہ بیٹی کی پیدائش کو اپنے لیے عیب سمجھتا تھا۔ قرآن پاک میں عربوں کی اس جاہلانہ ذہنیت کی طرف اشارہ ہے:

"وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ. يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ."

("ان میں جب کسی کو لڑکی ہونے کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے۔

اس بری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ کیا اس کو ذلت کے ساتھ لیے ہوئے ہی رہے یا اسے مٹی میں دبا دے،

آہ! کیا ہی برے فیصلے کرتے ہیں؟") (النحل، آیت:59-58)

آج کا سماج بھی تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور پسماندہ۔ جس سماج کو ہم ترقی یافتہ یا ترقی پذیر کہتے ہیں اُس میں بھی عورتوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ ہم چاہیے جتنی ترقی کر لیں ہماری ذہنیت آج بھی پست ہے۔

آج کی عورت بھی مغلوب ہے اور شوہر یا شوہر کے گھر والوں کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی، حتیٰ کہ وہ بھی بذات خود مردوں کی آرا سے اتفاق کرتے ہوئے بچیوں کی پیدائش کو منحوس سمجھنے لگی ہے اور اس سے نجات پانے کی خواہشمند ہو گئی ہے۔

ہمارا سماج آخر اس فلسفہ سے کیسے جڑا ہے۔ اگر غور کریں تو کئی اسباب دکھائی دیتے ہیں:

(1) سماج میں لڑکوں کو لڑکیوں پر فوقیت اس لیے دی جاتی ہے کیونکہ خیال کیا جاتا ہے کہ لڑکا خاندان کے لیے سود مند اور منافع بخش ہوتا ہے۔ والدین کے بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے اور وہ گھر کا سردار ہوتا ہے۔ اپنے والدین کی نگہداشت کا ذمہ دار ہوتا ہے اور خاندان کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ اور اس فلسفہ کی حمایت مذہبی رہنما بھی کرتے ہیں۔ ہندو سماج میں بیٹے کی پیدائش ضروری ہے چونکہ اسے ہی والدین کی آخری رسومات کی ذمہ داری نبھانی پڑتی ہے۔

(2) لڑکیاں بوجھ اور ذمہ داری ہوتی ہیں جسے ساری زندگی جھیلنا پڑتا ہے اور نتیجہ میں سختی اور تکلیف گوارہ کرنی پڑتی ہے۔ والدین کو پرورش میں مختلف قسم کی دشواریاں ہوتی ہیں جیسے انھیں تعلیم و تربیت دینا، زندگی میں سنورنے کے لیے سلیقہ سکھانا، استحکام پیدا کرنا وغیرہ۔ اس کے بعد اس کی شادی کی فکر، مناسب جوڑے کی تلاش، اس کے لیے تگ و دو ایک مرحلہ ہوتا ہے۔ اچھا سے اچھا خاوند تلاش کرنے اور پھر اسے کسی قیمت پر حاصل کرنے کی چاہ اور ہر جوکھم سے گزرنا پڑتا ہے۔

مزید یہ کہ بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا، عمدہ خصلت و عادات پیدا کرانا، مثالی بہو بننے میں تعاون، گھریلو ہنر یہ سب مخصوص اور اضافی تربیت میں شمار ہوتی ہیں تاکہ خاوند اور سسرال والوں کو خوش رکھ سکے اور خدانخواستہ اگر وہ امیدوں پر کھری نہ اتری تو والدین پر ہی ساری ذمہ داری عائد ہوگی۔ لہٰذا والدین سدا تناؤ اور مشقت کی زندگی گزارتے ہیں۔

(3) لڑکیوں کی شادی ایک گراں تقریب ہوتی ہے۔ والدین کو قیمتی تحائف، زیورات، ملبوسات، فرنیچر، ظروف، اور نہ جانے کیا کیا اکٹھا کرنا پڑتا ہے اور اس تگ و دو میں نہ جانے کیا کیا مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

کسی متوسط خاندان کے لیے یہ ایک سخت امتحان ہوتا ہے۔ اکثر اس کے لیے خاندانی زمین و جائیداد تک فروخت کرنا پڑتی ہے۔ اگر والدین ایسا نہ کر سکے تو سماج میں ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ والدین اس کے لیے ہر ممکن کوشش بلکہ اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر پورا کرتے ہیں تاکہ بیٹی سسرال میں سکون سے رہے اور اسے مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

(4) جہیز ایک سماجی برائی ہے مگر اس کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ لڑکے والے کثیر رقم اور قیمتی اشیا کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لڑکے کی قیمت دراصل اس کی سماجی حیثیت، معاشی حالات اور اس کی پوزیشن نیز تجارت پر منحصر ہوتی ہے جس کا فائدہ لڑکے والے پورا پورا اٹھاتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ لامتناہی فرمائشیں پوری نہ

ہوں تو شادی ٹوٹ بھی جاتی ہے اور والدین پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ والدین خود کو ہی کوستے ہیں اور خطا کار سمجھتے ہیں۔ رشتہ ٹوٹنے پر بیٹی کا جو حال ہوتا ہے وہ تصور سے باہر ہوتا ہے جس کا اندازہ ایک حساس انسان ہی لگا سکتا ہے۔

حالات کس قدر خطرناک ہیں اس کا آپ ایک سروے سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔

راجندر والیا نے پنجاب میں سروے کیا کہ بچی کی طفل کشی کے متعلق لوگوں کے کیا خیالات ہیں۔ 2001 میں یہ سروے پنجاب کے تین اضلاع لدھیانہ، بھٹنڈا اور فیروز پور میں ہوا جو بتدریج کم متوسط اور اونچے جنسی تناسب والے علاقے ہیں۔

240 لوگوں میں 44.17 فیصد کسانوں نے اور 38.33 فیصد غیر کسان آبادی نے بچی کی طفل کشی کو جائز قرار دیا اور 41.25 فیصد نے اس ایکٹ کی طرفداری کی اور 37.08 فیصد کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔

لدھیانہ میں 58.73% نے اس ایکٹ کو منظوری دینے کی بات کی لیکن فیروز پور میں 80% اس سے متفق نہ تھے۔

80% لوگوں نے جہیز کو سبب بتایا اور قیمتوں میں اضافے کی بات کی۔

70% لوگوں نے بتایا کہ لڑکیاں سماجی تحفظ مہیا نہیں کر سکتی ہیں۔ انھیں سسرال جانا ہوتا ہے۔ دلچسپ بات سامنے یہ آئی کہ 68% لوگوں نے لڑکیوں کے وجود کو ہی غیر ضروری ٹھہرایا اور 3% لوگوں نے کہا کہ بچیوں کا قتل بچیوں کی آبادی روکنے کے لیے مناسب ہے۔

UNICEF کی رپورٹ کے مطابق 50 ملین بچیاں اور عورتیں ہندستانی آبادی سے غائب ہیں جس کا سبب جنسی امتیاز ہے۔

ایسا اندازہ ہے کہ 2020 تک 35 ملین زائد مرد چین اور ہندوستان میں پائے جائیں گے۔

یہ بات من گھڑت نہیں بلکہ سچ ہے کہ نوبل انعام یافتہ ''امرتا سین'' نے 1990 میں ایک مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا ''100 ملین غائب عورتیں''۔

زیادہ تر ملکوں میں تقریباً 105 عورتیں ہر 100 مردوں پر ہوتی ہیں مگر ہندستانی آبادی میں 93 عورتیں 100 مردوں کے مقابلے ہیں۔

رفتہ رفتہ گرتا گراف قومی جنسی تناسب کے لیے نہایت تشویش ناک ہے کیونکہ گزشتہ 50 سال میں یہ تناسب تیزی سے تبدیل ہوا ہے۔

اب ایک نظر گرتے ہوئے تناسب پر ڈالیں جو مکمل ایک صدی کا ہے۔

مردم شماری 2001 میں ایک ہزار بچوں کے مقابلے میں بچیوں کی تعداد:

972	-	1901
964	-	1911
955	-	1921
950	-	1931
945	-	1941
946	-	1951

OOO

خودکشی
(Suicide)

خودکشی (Suicide) ایک ایسا عمل ہے جس میں دانستہ طور پر کوئی شخص اپنے کو ہلاک کر لے۔ یہ عمل اکثر مایوسی اور ناامیدی کے نتیجہ میں یا پھر ذہنی اور نفسیاتی مرض کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ جیسے افسردگی (Depression)، ذہنی پراگندگی (Schizophrenia)، شراب نوشی (Alcohalism)، منشیات کے مضر اثرات (Drug Abuse) وغیرہ۔ مالی مشکلات، گھریلو ناچاقی، عشق میں ناکامی وغیرہ بھی اسباب ہوتے ہیں۔

تقریباً دس لاکھ لوگ ہر سال خودکشی کو اپناتے ہیں۔ WHO کے اندازے کے مطابق پوری دنیا میں خودکشی موت کا تیرھواں سبب مانا جاتا ہے اور وہ بھی بالخصوص 35 سال سے کم عمر کے نوجوانوں میں یہ عام ہے۔ 10 سے 20 ملین لوگ پوری دنیا میں خودکشی کی کوشش کرتے ہیں مگر بچ جاتے ہیں۔

خودکشی مختلف تہذیبوں اور ادیان میں مختلف نظریہ رکھتا ہے جیسے دین ابراہیمی میں خودکشی قانون خداوندی کی خلاف ورزی ہے اور ایک سنگین جرم ہے۔ اس کے برخلاف جاپان میں زمانہ ساموارئی (Samurai) میں Seppuku گناہوں کے کفارہ کے لیے ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں اس نے خودسوزی کی شکل اختیار کی اور Kamikaze اور خودکش بم کا بھی استعمال ہوا۔

اسی طرح سے ہندوستان میں بھی زمانہ قدیم سے ہی گزشتہ صدی تک ستی کا رواج قائم تھا جس میں شوہر کی چتا پر بیوی خود کو خودسوزی کے لیے پیش کرتی تھی یا اس پر اپنوں، خصوصاً سسرال کی طرف سے دباؤ دیا جاتا تھا۔

قتل بجذبۂ رحم یعنی طبیب کی مدد سے خودکشی بھی موجودہ صدی میں موضوع بحث ہے۔ اور اخلاقی دلیلیں مخالفت اور موافقت میں دی جارہی ہیں تاکہ ضعیف و ناتواں، درد و الم میں بے بس یا پھر نباتاتی حالت کو پہنچنے پر اُسے موت دے کر تکلیف سے نجات دلائی جاسکے۔

خودکشی کی درجہ بندی:

خود کو اذیت پہنچانا یا نقصان پہنچانا، خودکشی کی کوشش کرنا، خودکشی نہیں مانا جاتا۔

قتل بجذبۂ رحم:

جسے اب طبیب کی مدد سے خودکشی کہا جاتا ہے۔

کوئی انسان انتہا درجہ کی بیماری، تکلیف یا اذیت میں مبتلا ہوتا ہے اور خود کو ہلاک کرنا چاہتا ہے اور اس کی مدد خاندان کے افراد یا طبیب کرتے ہیں۔ کبھی اسے کمپیوٹر کی مدد سے خودکشی کرائی جاتی ہے تو یہ بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جو متنازع فیہ ہے اور بعض ملکوں میں سیاسی مسئلہ بنا ہوا ہے جیسے Dr. Jack Kevorkian جو Dr. Death کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اس طبیب نے بے شمار لوگوں کو خودکشی میں مدد پہنچائی جس کے نتیجہ میں اسے قید ملی۔

قتل۔ خودکشی:

یہ وہ حالت ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص یا اشخاص کو موت کے گھاٹ اتار کر خودکشی کر لیتا ہے۔ اس طرح کی خودکشی ہمیں آئے دن اخباروں یا ٹیلی ویژن پر دیکھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔ یہ عمل مجرمانہ بھی ہوسکتا ہے اور کسی کے لیے بے انتہا چاہت کے نتیجہ میں افسردگی کے سبب بھی ہوسکتا ہے۔

خودکش حملہ:

یہ وہ عمل ہے جس میں حملہ آور دوسروں کو نقصان پہنچانے، خاص کر فوجی یا سیاسی حدف کے حصول کے لیے ہوتا ہے خواہ اس کے نتیجہ میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ خودکش

دھماکے دہشت گردی کی مثالیں ہیں۔تاریخ کے اوراق میں زارروس، اسکندر روم، نیز جنگ عظیم دوم کے موقع پر جاپانیوں کے Kamikaze کی مثال محفوظ ہیں۔

اجتماعی خودکشی:

اکثر ایسا دیکھنے کو ملتا ہے جب کسی دباؤ میں آکر، یا کسی گروپ میں کئی یا دو لوگ مل کر خودکشی کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ اکثر بعض معبد، بُت خانوں یا دوسری جگہ جیسے بعض امریکی Cult اجتماعی خودکشی کرلیتے ہیں۔

خودکشی معاہدہ:

دو یا زیادہ افراد باہم خودکشی کا فیصلہ کرتے ہیں جس میں یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ ساتھ ساتھ یا ایک وقت میں ہی الگ الگ خودکشی کی جائے اسے Mass Suicide سے مختلف مانا جاتا ہے۔ چونکہ بعض نظریاتی ہم آہنگی خصوصاً مذہبی افکار کے نتیجے میں یہ عمل ہوتا ہے۔لیکن خودکش معاہدے میں اکثر شادی شدہ یا غیر شادی شدہ رومانی جوڑے، خاندان کے افراد یا احباب حصہ لیتے ہیں اوراس میں ان کا ذاتی یا انفرادی فیصلہ ہوتا ہے۔

استعاراتی خودکشی:

اس میں اپنی خواہش سے ہی خودکشی کو آمادہ ہونا اوراس کا نتیجہ سیاسی حصول ہو۔

خودکشی کی وجوہات:

خودکشی کی وجوہات تو کچھ بھی ہوسکتی ہیں اوران کی تعداد متعین کرنا ناممکن ہے۔لیکن اہم وجوہات میں سب سے اہم افسردگی ہے۔

افسردگی(Depression):

یہ ایک دماغی مرض ہے جسے Unipolar Affective Disorder بھی کہاجاتا ہے اورنفسیاتی ہے۔جس میں مزاجاً انسان بجھا بجھا سا رہتا ہے اورکبھی کبھی جذباتی طور پراداس رہتا ہے اور بیزاری نظر آتی ہے۔اکثر لوگ اسے خودمحسوس بھی کرلیتے ہیں لیکن اس کے برعکس کبھی انسان بہت خوش اورمست مولا دکھتا ہےمگر وہ اس مرض میں مبتلا رہتا ہے۔

افسردگی کی کئی کیفیات ہوسکتی ہیں۔

- مزاجاً بجھا بجھا رہنا
- ادراک واحساس کہ میں بے کار ہوں، لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔
- گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ صبح غمگین شام میں خوش وخرم
- کم خوابی
- بھوک کی کمی
- ہروقت تناؤ خواہ وہ گھر ہو، دفتر ہو یا کوئی اور جگہ ہو

تنہائی (Isolation):

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تنہا رہتا ہو بلکہ سب کے ساتھ رہنے پر بھی وہ خود کو تنہا سمجھے اور لوگوں سے Detached محسوس کرے۔

بعض اشیاء کا بے جا استعمال:

جیسے منشیات ومخدرات نیز الکحل کا بے جا اور بے انتہا استعمال۔ غم غلط کرنے کے لیے بعض دوائیں اور شراب نوشی کا سہارا لینے والے اکثر خودکشی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

تقریباً 25% نوجوان الکحل کے عادی خودکشی کرتے ہیں۔ کوکن کے استعمال کرنے والے بھی دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اچانک روکنے پر (Withdrawl) سے خودکشی کی خواہش میں تیزی آجاتی ہے۔ روزانہ چھ بار پینے والے چھ گنا خودکشی کے لیے مائل ہوتے ہیں۔

نشیات میں Benzodiazepine کا استعمال یا بے جا استعمال افسردگی پیدا کرتا ہے اور خودکشی کا محرک ہوتا ہے۔ 11% مرد اور 23% عورتیں خواب آور گولیوں کی عادی خودکشی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

سگارنوشی:

شگارنوشی بھی خودکشی کا سبب پائی گئی ہے۔ جو لوگ روزانہ 24 سگریٹ پیتے ہیں وہ خود کو دو گنے Risk پر ڈالتے ہیں۔ 25 یا اس سے زیادہ پینے والے چار گنا Risk پر ہوتے ہیں۔

قمار بازی (جوا):

جوا کھیلنے والوں میں ہار کو برداشت نہ کر پانے میں خودکشی کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے بالخصوص سن رسیدہ لوگوں میں یہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ 2010 میں ہی آسٹریلیا کے ایک اسپتال کے سروے کے مطابق 17% خودکشی کرنے والے جوا ایمرجنسی (الفریڈ ہاسپٹل) میں لائے گئے انھوں نے جوا کی وجہ سے خودکشی کی تھی۔

حیاتیاتی:

اکثر دیکھا گیا ہے کہ خودکشی کا مادّہ خاندانی بھی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا تعلق دماغی خلل سے موروثی ہی ہوگا جو نسل در نسل چلتا جاتا ہے۔

سماجی:

کسی بات کو حکومت سے منوانے کے لیے یا زور پیدا کرنے کے لیے اکثر بھوک ہڑتال کے لیے بیٹھ جاتے ہیں اور خودکشی کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آئرلینڈ میں IRA نے مانگ رکھی تھی کہ قیدیوں کی نئے طریقے سے درجہ بندی کی جائے تاکہ قیدیوں میں جنگی قیدی اور دہشت گردوں میں فرق معلوم ہو۔

1981 میں Bobysands کی قیادت میں بھوک ہڑتال شروع ہوئی جس میں 10 جانیں گئیں اور موت کا سبب ''شدید فاقہ زدگی'' مانا گیا۔

عدالتی خودکشی:

ایک فرد جس نے جرم کیا ہے وہ سزا اور بے عزتی کے خوف سے خودکشی کرلے وہ عدالتی خودکشی کہی گئی۔ جیسے نازی لیڈر ''ہرمان گورنگ'' نے سائینائیڈ کیپسول کا استعمال کر کے پھانسی سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی تھی۔ ورجینا اسکول میں جو قتل عام ہوا تھا اس کے مجرم نے بھی خودکشی کر لی تھی۔

فوجی خودکشی:

جنگ عظیم دوم میں بعض جاپانی ہوابازوں نے Kamikaze مشن کی پیش کش کی تھی تاکہ جاپانی شہنشاہیت کی ہار نہ ہو نیز جاپان کی بری فوج نے Banzai Charges شروع کر دیے تھے۔

اس کے علاوہ جاپانیوں نے ایک چھوٹا جہاز بنایا جس کا مقصد صرف Kamikaze مشن تھا۔

نازی جرمنی میں بہتیرے فوجی اور سرکاری کارندوں بشمول ہٹلر نے الائیڈ فورسیز کے سامنے خود سپردگی کے بجائے خودکشی کو ترجیح دی۔ جاپانیوں نے انسانی ٹورپیڈو بھی بنایا تاکہ آبدوز کشتیوں کو تباہ کیا جاسکے۔

خودکشی برائے نجات:

ایسے وقت میں جہاں زندہ رہنا برداشت سے باہر ہو بعض لوگ خودکشی کو ترجیح دیتے ہیں جیسے ظلم و استبداد سے نجات پانے کے لیے نازی کیمپ میں دانستہ طور پر بجلی سے جڑے باڑھ کے تار کو پکڑ کر جان دے دی۔

بمبئی کے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس کی رپورٹ کے مطابق 150,000 مقروض کسانوں نے ابھی پچھلے دہائی میں خودکشی کر لی۔

خودکشی برائے فرد خانہ یا عزیز دوست:

بہت قریبی رشتہ دار یا نہایت عزیز فرد خانہ کی اچانک موت کا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے اکثر لوگ خودکشی کر لیتے ہیں۔ ابھی حال میں ہی ڈاکٹر ریڈی، وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش کی ہوائی سفر اور حادثہ میں موت کے بعد کئی لوگوں نے خودکشی کر لی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا ایسا کرنے سے قبر میں ساتھ ہو جائے گا اور کچھ تو ایسا خیال کرتے ہیں کہ اب ان کی زندگی لاحاصل ہے۔

خودکشی برائے مالی بحران:

بعض لوگ بڑے قرضے کی وجہ سے مقروض ہوتے ہیں اور قلاش ہوتے ہیں وہ خودکشی کا سہارا لیتے ہیں۔

کچھ اعداد و شمار بھی خودکشی سے متعلق دیکھ لیں جو چونکا دینے والے ہیں:

- WHO کے اندازے کے مطابق ایک ملین سے زائد لوگ خودکشی سے مرتے ہیں۔
- پوری دنیا میں ۱۱ انسان فی لاکھ خودکشی کرتے ہیں۔

- ایک موت ہر 40 سیکنڈ پر خودکشی سے ہوتی ہے۔
- پچھلے پچاس سال میں شرح خودکشی 65% بڑھ گئی ہے۔
- 14-44 سال کے اشخاص میں خودکشی سے موت تیسرے نمبر پر ہے۔
- خودکشی کی کوشش 20 گنا خودکشی سے زیادہ ہے۔
- گرچہ خودکشی عمر رسیدہ لوگوں میں زیادہ ہے پھر بھی شرح نوجوانوں میں تیزی سے بڑھ رہی ہے۔
- ذہنی خلل 90% خودکشی کا سبب بنتا ہے۔
- عورتوں کے مقابلے مردوں میں خودکشی چار گنا زیادہ ہے۔ مگر عورتوں کی شرح کوشش خودکشی مردوں سے زیادہ ہے۔
- برطانیہ میں دو نوجوان ہر روز خودکشی کرتے ہیں۔
- عالمی پیمانے پر 80% خودکشی نوجوان کرتے ہیں۔
- الکحل، منشیات اور دوسری اشیا نوجوانوں میں خودکشی کا باعث ہوتی ہیں۔
- نوجوانوں میں خودکشی، بے روزگاری، سماجی علاحدگی، روزمرہ کی ان بن، والدین کے ساتھ عدم ہم آہنگی۔
- ٹریفک حادثات سے دوگنا خودکشی کی موت ہے۔
- ہر تیسرے منٹ پر کوئی نہ کوئی اپنے کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔
- کسی بھی وقت میں کم از کم 463,000 لوگ خودکشی کے بارے میں سوچتے ہیں۔
- ہر سال کم از کم 2500 بچے یا نوخیز Child-Line پر فون کر کے خودکشی کی چاہت کے لیے فون کرتے ہیں۔
- ضرورت سے زیادہ خوراک 50% عورتوں اور 25% مردوں میں خودکشی کا سبب بنتی ہے۔

خودکشی کے طریقے:

خودکشی کے طریقے دنیا بھر میں اور ملکوں ملکوں میں مختلف نوعیت کے ہیں لیکن عام طریقہ

خودکو چھت سے پھانسی لگانے کا ہےاور سب سے پسندیدہ اور مروج طریقہ پنکھے سے لٹکنے کا ہے۔
اس کے علاوہ کیڑے مکوڑوں کو مارنے والی دوائیں، پستول، بندوق کا استعمال بھی عام ہے۔
بلندی سے چھلانگ لگانا، ریل کی پٹریوں پر کٹ جانا، رگوں کا کاٹ لینا، سمندر یا ندی میں چھلانگ لگانا عام طریقہ ہے۔

پوری دنیا میں 30% اموات حشرات کش (Pesticides) سے ہوتی ہیں۔لیکن یہی طریقہ دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف ہے جیسے اگر یورپ میں 4% ہے تو خطہ اُقیانوس میں 50% ہے۔امریکہ میں 52% خودکشی بندوقوں اور طمنچوں سے ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا طریقوں کے علاوہ فاقہ کشی، انجکشن وغیرہ بھی ہے۔

1966 کی ایک تحقیق میں دوستوں کے درمیان تعلقات کی بنا پر خودکشی ثابت نہیں ہو پائی تھی مگر 1986 میں شرح میں زیادتی ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والی خودکشی کے خبروں سے بڑھی۔

WHO کے مطابق دنیا میں تمام ہونے والی خودکشی میں سب سے زیادہ ایشیا میں 60% بالخصوص چین، جاپان اور ہندوستان مجموعی طور پر 40% ہے۔

مختلف ادیان میں نظریہ الگ الگ ہے:

یہودی:

قانون یہودی میں خودکشی ممنوع ہے اور یہ عمل ایک عظیم گناہ ہے۔کسی بھی حال میں یہ گناہوں کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔حتیٰ کہ خودکشی میں کسی بھی قسم کی امداد بھی ممنوع ہے۔Leviticus، 19:14 میں اس کی سخت ممانعت ہے۔

عیسائی:

بائبل میں سات عدد خودکشی کا ذکر ہے جس میں سب سے نمایاں Mathew، Judas Iscariot 27:3-5 کا خودکشی کرنا جس نے عیسیٰ مسیح کو دغا دی تھی۔

کیتھولک چرچ کے نظریہ کے مطابق خودکشی سے موت ایک بڑا گناہ ہے۔چونکہ زندگی

خداوندقدوس کا عنایت کردہ تحفہ ہے اوراسے ختم کر لینا کفران نعمت ہے۔

پروٹسنٹ کے مطابق چونکہ خودکشی میں اپنی ہلاکت ہے لہٰذا جوخودکشی کرتا ہے وہ اسی طرح گناہ میں مبتلا ہوتا ہے جیسے وہ دوسرے شخص کو ہلاک کرے۔

لیکن اس گروہ میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ عیسیٰ مسیح شفاعت کریں گے لہٰذا موت سے پہلے Salvation کا یہ طریقہ ہے لہٰذا غیر قابل معافی گناہ تحفہ Salvation سے انکار ہے۔

اسلام:

مذہب اسلام میں بھی خودکشی گناہ عظیم ہے اور قرآن نے بڑے واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"وَلاَ تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيماً."

''اوراپنے آپ کوقتل نہ کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے۔''

(سورۃ النساء، آیت:29)

یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''جوشخص خودکشی گلا گھونٹ کر کرے گا وہ جہنم میں اپنا گلا گھونٹتا رہے گا اور جوخود خنجر سے مرے گا وہ جہنم کی آگ میں خود خنجر مارتا رہے گا۔''

ہندو:

ہندو مذہب میں بھی خودکشی پاپ ہے لیکن ساتھ ساتھ ستی کو استثناء مانا گیا۔ ہندو عقیدہ ہے کہ خودکشی سے مرنے والے کی آتما آوارہ پھرتی ہے۔ جب تک کہ اس کی اصلی موت نہ آجائے پھر بھی ہندو عقیدے میں غیر تشدد طریقے یعنی فاقہ سے خودکشی کی اجازت ہے اور تمام ذمہ داری سے سبکدوشی کے بعد اگر زندہ رہنے کی خواہش نہیں تو وہ خود کو ختم کر سکتے ہیں۔

جین:

جین مذہب ان چند مذاہب میں آتے ہیں جو خودکشی کی اجازت دیتے ہیں۔ چونکہ اکثر جین منی فاقہ کر کے اپنی جان دے دیتے ہیں۔ جین مذہب بھی عدم تشدد کی راہ پر چلتے ہوئے فاقہ سے جان دے سکتے ہیں جسے سنتھرا کہتے ہیں۔

بودھ:

بودھ مذہب میں حیات وممات کا تصور بالکل مختلف ہے۔ لہٰذا خودکشی کو جائز قرار نہیں دیا جاتا پھر بھی احتجاجاً خودکشی ہوتی رہی ہے اور رشی منی کی نظر میں قابل قبول ہے۔

مذہبی گروہ (Cult):

بعض مذہبی گروہ نہ صرف خودکشی کی اجازت دیتے ہیں بلکہ ممبران کو ترغیب دیتے ہیں۔ نظریہ یہ ہے کہ خودکشی راہ نجات ہے اور ارواح بہتر دنیا میں جاسکتی ہے جو اس دنیا سے اچھی ہو۔

OOO

خودکش حملہ
(Kamikaze)

آج صبح یعنی 16 ردسمبر کی صبح جب میں سائنس اردو کے لیے لکھنے بیٹھا اور جس موضوع پر آج لکھنا چاہتا تھا اور کئی روز سے اس پر غور کر رہا تھا کہ روزنامہ راشٹریہ سہارا کا اردو شمارہ آ گیا۔ سرخیوں پر نگاہ ڈالتے ہیں پہلے صفحہ پر یہ خبر تھی ''ایران۔ خودکش حملے میں 40 ہلاک'' یہ دھماکہ سستیان صوبہ کے چاہ بہار شہر میں واقع ایک مسجد کے باہر ہوا تھا۔ مقامی اہلکاروں کے مطابق دو حملہ آور تھے جن میں سے ایک کو حراست میں لے لیا گیا۔ آج سے کچھ دنوں پہلے ایسی خبروں پر انسان متفکر ہو جاتا تھا مگر پچھلے کئی دہائیوں میں ایسے حملے اتنے ہوئے ہیں کہ اب جیسے عام بات ہوگئی ہے۔

خودکش حملہ:

خودکش حملہ یا (Kamikaze) ایک ایسا عمل ہے جس میں حملہ آور بخوبی جانتا ہے کہ اس عمل میں اس کی جان چلی جائے گی۔ لیکن وہ دوسروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ نیر بے حساب تباہی لائے گا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تباہی لانے والا ہی ایک کامیاب حملہ آور ہوتا ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ کیا یہ نفسیاتی بیماری ہے، دماغی خلل ہے یا کوئی اور سبب ہے۔ ظاہر ہے آج کے دور میں اسے دہشت گردی کا نام دیا جائے گا۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ آج اس موضوع پر ذرا تاریخ کے اوراق بھی پلٹ لوں تا کہ باتیں اور اسباب واضح ہوتی چلیں۔

خودکش دھماکوں کا جب ذکر ہوتا ہے تو چند ہی ممالک کے نقشے سامنے آجاتے ہیں جن میں سری لنکا، عراق، لبنان، فلسطین، پاکستان وغیرہ سرخیوں میں رہے ہیں اور یہ سب حملے تقریباً نصف صدی آخر کے ہیں۔ گرچہ صرف چوتھائی صدی سے ہی یہ ہتھکنڈے یا حکمت علمی اپنائی جانے لگی ہے مگر تاریخ میں ایک زمانہ سے اس حکمت عملی (Strategy) کا استعمال ہوا ہے۔

بائبل کتاب کی مصنفین (Book of Judges) میں Samson نام کے یہودی کو ہیرو کا درجہ دیا گیا اور ذکر کیا گیا کہ اُس نے خودکش حملہ کر کے فلسطینی معبد کو ڈھا کر کس طرح تین ہزار فلسطینیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

سترھویں صدی کے اواخر میں ڈچ فوجی جو سنگا فوجیوں سے تائیوان پر قبضہ پانے کے لیے 1661 میں لڑ رہے تھے کس طرح بارود سے خود کو اور دشمنوں کو اڑا دیتے تھے تا کہ قید سے بچ سکیں۔ اسی طرح بلجیم کے انقلاب کے دوران ایک ڈچ افسر نے اپنی آبدوز کو قید ہونے سے بچنے کے لیے اڑا دیا۔

18/اپریل 1864 میں دائبال کے جنگ میں پروسین فوجی کارل کلنگ نے ڈینش حصار کو توڑنے کے لیے خود کو موت سے ہمکنار کیا۔

اٹھارھویں صدی میں ہی جان پال جونز نے لکھا ہے کہ عثمانی ملاحوں نے اپنی کشتیوں میں دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے آگ لگا دی جبکہ وہ جانتے تھے کہ اس سے خود ان کی خاصی تعداد فوت ہوگی۔ 1881 میں زار روس جب سینٹ پیٹر برگ کے مرکزی شاہراہ سے گزر رہا تھا تو اس پر حملہ کیا گیا جس میں حملہ آور بھی فوت ہو گیا۔

اسی طرح اڈولف ہٹلر کو بھی 1943 میں خودکش حملہ آور نے مارنا چاہا مگر حملہ کامیاب نہ ہو سکا۔ یعنی خودکش حملے سیاسی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال ہونے لگے۔

Kamikaze جنگ عظیم دوم کی ہی ایجاد ہے جو جاپان میں استعمال ہوئی اور اصطلاح بن گئی۔

دورجدید:

خودکش حملے 1980 میں چند ہی واقعات تک محدود تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ حکمت عملی مقبولیت حاصل کرنے لگی۔ 2000 تک پہنچتے پہنچتے یہ تعداد بڑھ کر 81 ہوگئی اور 2001 سے 2005 کے دوران یہ تعداد بڑھ کر 460 ہوگئی۔

اس قسم کے حملوں کے نشانے نہ صرف فوجی ٹھکانے رہے بلکہ سیاست داں اور عام شہری بھی ہدف بنے۔ اس قسم کے حملے سری لنکا اور اسرائیل میں 1989 تک ہوتے رہے اور پھر اس کا رخ عراق کی طرف ہوا۔ 2003 میں امریکی گھس پیٹھ کے بعد ہی عراق میں یہ صورتحال عام ہوئی پھر پاکستان اور افغانستان میں تو حدیں پار ہونے لگیں۔

دورجدید کا سب سے پہلا خودکش حملہ 1981 میں واقع ہوا اور لبنان کی خانہ جنگی میں کامیاب ثابت ہوا جسے سری لنکا کے LTTE نے اور بھی شدت دی اور دیکھتے دیکھتے درجنوں ملک میں یہ حکمت عملی اپنائی گئی۔ سری لنکا کے طویل نسلی، تنازع، لبنان میں خانہ جنگی اور اسرائیل و فلسطین میں مذہبی شدت نے اس کو ایک الگ شناخت دی اور امریکی واستبداد کے نتیجے میں یہ عراق میں عام ہوگیا۔

گرچہ یہ حملہ اور دھماکہ پہلی بار لبنان کی سرزمین پر واقع ہوا مگر سری لنکا میں LTTE نے اس حکمت عملی کو کامل اور کارگر بنایا جس کی وجہ سے یہ دوسرے ملکوں میں بھی مقبول ہوا۔ سری لنکا میں بلیک ٹائیگر اکائی نے تقریباً 76 سے 168 خودکش حملے کیے جو 1987 سے شروع ہوئے اور گمان ہے کہ دنیا کے نصف سے زائد خودکش حملے 1981 سے 2000 تک ہوئے جس میں آنجہانی وزیراعظم راجیو گاندھی اور صدر سری لنکا رانا سنگھے پریم داسا کی جان گئی۔

خودکش حملے فلسطینی تنظیموں جیسے حمسی، اسلامی جہاد اور لشکر شہدائے الاقصیٰ وغیرہ میں مقبول رہے۔ اس گروپ کے افراد خودکش کمر بند "Suicide Belt" کہلانے لگے۔ بارود اور اس میں خطرناک مواد لباس کے اندر باندھ دیے جاتے اور زیادہ سے زیادہ اموات کی

خاطر قہوہ خانوں، بسوں، بھیڑ بھاڑ والی جگہ اور مصروف اوقات میں یا غیر محفوظ فوجی ٹھکانوں جیسی جگہ انتخاب کی جاتی۔ کامیاب حملہ آور وہی مانا جاتا جو اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نشانہ بنا سکتا۔

اسرائیل میں فلسطینی خودکش حملہ آور، مسافروں کی بسوں، ہوٹل، ریستوران، بازار اور مارکیٹ کو نشانہ بناتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ بچوں کو اکسانے کے لیے الیکٹرونک میڈیا کا بھی استعمال کیا جاتا تھا اور جام شہادت نوش کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔

اسرائیلی اکثر الزام دیتے آئے ہیں کہ حمس، جہاد اسلامی اور فتح بہشتی کیمپ بناتے ہیں اور 11 سال تک کے بچوں کو خودکش حملہ آور بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔

ماضی قریب میں عراق اور افغانستان میں خودکش حملوں کے بعد چیچنیا میں بھی یہ ٹیکٹس اپنائی گئی۔ 2000 میں ایک عورت روسی فوج کی چھاؤنی الخان کلا میں بارود سے بھرے ٹرک کو لے کر گھس گئی۔ ماسکو کے میٹرو میں بھی چیچنیا کے تنازع کا سبب مانی جاتی ہے۔

امریکہ کی نیابت میں اتحادی ملکوں کے 2003 میں عراق میں گھس پیٹھ کے نتیجہ میں خودکش حملوں کا جیسے سلسلہ شروع ہوگیا۔ امریکی فوجوں کو ہدف بنا کر یہ حملے ہوئے مگر ساتھ ساتھ عوام کا بھی بے حد جانی و مالی نقصان ہوا پھر 30 رجنوری 2005 میں پارلیامانی الیکشن کے اعلان کے بعد یہ سلسلہ اور بھی شدت پکڑنے لگا اور اس کام کے لیے جنگ کے زمانے کے معذوروں کو استعمال کیا جانے لگا۔

2008 میں باری پاکستان کی آئی اور افغانستان اور عراق کے بعد یہاں خودکش حملوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ 28 ایسے واقعات میں 471 لوگ مارے گئے۔

عام طور پر جو طریقہ کار خودکش حملہ آور اپناتے ہیں ان کی چند مثالیں:

- پیادہ حملہ آور: بارودی بیلٹ (کمر بند) کا استعمال کرتے ہیں
- ہوائی جہاز: اچہ ڈ دیڑ کا امریکی ایئر لائنز پر حملہ فلائیٹ 63 مشہور ہے۔
- جسم میں چھپا کر بارودی حملہ: سعودی شہزاد محمد بن تالیف کے لیے 2009 میں استعمال ہوا۔

- خودکش کار حملہ: 1983 میں بیروت کے فوجی ٹھکانے پر، سری لنکا سنٹرل بینک اور عراق میں 2003 کے بعد کئی ایسے حملے ہوئے۔
- سمندری کشتی میں بارودی حملہ: USS کول پر حملہ جو عدن کے ساحل پر واقع تھا۔
- آبدوز کشتیاں جو بارود سے بھری تھیں جاپان نے جنگ عظیم دوم میں استعمال کیں۔
- بیلٹ یا عورت کے اندرونی لباس (ترابم) جو آنجہانی راجیو گاندھی وزیراعظم ہند کے خلاف تن مولی راج رتنم نے جس کا تعلق LTTE سے تھا، استعمال کیا۔
- خودکش بم جو سائیکل میں استعمال ہوا اور سری لنکا کے صدر رانا سنگھا پریم داسا کے قتل کے لیے LTTE نے استعمال کیا۔
- مسافر ایئر جیٹ جو ایندھن سے بھرا تھا، 11 ستمبر کو استعمال ہوا۔
- مسافر سے بھری بس پر تیل ابیب (یروشلم) میں حملہ۔
- ہندستانی پارلیمنٹ پر دسمبر 2001 میں حملہ جس میں 15 لوگ مرے۔

خودکش حملوں میں دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے لوگ ملوث ہوتے ہیں۔ 80% لوگ جسمانی اور دماغی طور پر معذور ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف یادگاری کے مطالعہ کے مطابق افغانستان میں 80% لوگ جسمانی طور پر معذور تھے اور اکثر کے ہاتھ یا پیر کٹے ہوئے تھے۔ بعض سرطان، جذام اور دوسرے امراض میں مبتلا تھے۔

اسی طرح مارک سیج مین نے پایا تھا کہ خودکش حملوں میں ملوث لوگ یا تو دماغی اور ذہنی مریض تھے یا انھیں کوئی صدمہ پہنچ چکا تھا یا نفسیاتی مریض تھے۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر البرٹو عبادی کے مطابق دہشت گردی غربت اور تنگی کے سبب نہیں بلکہ سیاسی آزادی کے نتیجہ میں پنپتی ہے بالخصوص ان ملک میں جہاں ڈیموکریسی جنم لے رہی ہوتی ہے اور سیاسی عبوری دور سے ملک گزر رہا ہوتا ہے۔ چونکہ حکومت بھی کمزور ہوتی ہے اور سیاسی استحکام نہیں ہوتا لہٰذا دہشت گردی کو طاقت ملتی ہے۔ اکثر حملہ آور جو پڑھے لکھے ہوتے ہیں ان میں کوئی نفسیاتی مرض نہیں ہوتا اس کے باوجود تنظیموں کے لیڈر ایسے کچے ذہن کے لوگوں کو تیار

کرتے ہیں کہ یہ بہ آسانی جُرم کا ارتکاب کر سکیں۔ بعض موقعوں پر اس مشن پر جانے والے نہ صرف اپنا معاوضہ بلکہ گو کہ افراد کا بھی طے کر لیتے ہیں اور اکثر مذہب کے نام پر شہادت کے جذبے کے تحت یہ کام کرتے ہیں۔ مسلم نوجوان گمراہ ہو جاتے ہیں اور شہادت کے نام پر کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔

صرف عراق میں 2004 میں کم از کم 400 خودکش حملے ہوئے جن میں 2000 افراد کی موت واقع ہوئی۔

Hough Barlow اپنی کتاب Dead for God میں حال کے خودکش حملوں کے متعلق لکھتا ہے کہ شہادت کی طویل تاریخ میں یہ نیا باب ہے جو غارت گری کے ساتھ شہادت کی مثال پیش کرتا ہے۔

بعض عناصر ای میل، جہادی کتب، انٹرنٹ اور دوسرے جدید الیکٹرونک میڈیا سے یا شدت پسند استاد یا رہنما جن کا دہشت گردی ایجنڈا ہوتا ہے ان سے متاثر ہو کر ایسا قدم اٹھاتے ہیں۔

شکاگو پروجیکٹ آن سوسائیڈ ٹیررزم نے ایک رپورٹ تیار کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ 300 خودکش حملوں میں سے 240 حملوں میں 1980 سے 2003 کے درمیان اسلامی تنظیم ملوث تھی یا مسلم اکثریت والی سرزمین تھی۔

اسی طرح کا ایک اندازہ ہے کہ 2008 کے اوائل تک 1121 مسلم خودکش حملہ آوروں نے خود کو عراق میں اڑالیا۔

سیاسی، سماجی، معاشی اسباب ان حملوں کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں مگر اکثریت کا ماننا ہے کہ اس سے بڑھ کر مذہبی شدت خودکش حملوں کی بنیاد تیار کرتی ہے کیونکہ اسلام کے نام پر شہادت حاصل کرنا نیک عمل ہے اور شہیدوں کے لیے جنت کے دروازے کھلے ہیں۔ شہادت کے خواہاں کو سورۃ توبہ، آیت: 111 کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

"إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ
الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ

حَقّاً فِیْ التَّوْرَاۃِ وَالإِنجِیْلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَی بِعَھْدِہِ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُواْ بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُم بِہِ وَذَلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔"

(''بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے، تو تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے مطالعہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔'')

(التوبہ، آیت: 111)

کلام پاک میں بڑے واضح الفاظ میں خودکشی کے متعلق لکھا ہے:

"یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ لاَ تَأْکُلُواْ أَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَن تَکُونَ تِجَارَۃً عَن تَرَاضٍ مِّنکُمْ وَلاَ تَقْتُلُواْ أَنفُسَکُمْ إِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْماً۔ وَمَن یَفْعَلْ ذَلِکَ عُدْوَاناً وَظُلْماً فَسَوْفَ نُصْلِیْہِ نَاراً وَکَانَ ذَلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْراً۔"

(''اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضامندی سے ہو خرید و فروخت، اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے اور جو شخص یہ سرکشی اور ظلم کرے گا تو عنقریب ہم اس کو آگ میں داخل کریں گے۔ اور یہ اللہ پر آسان ہے۔'')

(سورۃ النساء، آیت: 29-28)

کلام الٰہی جو سرچشمہ حیات ہے بڑے واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"وَقَاتِلُواْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُونَکُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّٰہَ لاَ یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔"

(''لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو
اللہ تعالٰی زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔'')

(سورۃ البقرہ، آیت:190)

انسانی معاشرے کی زندگی اور امن وسکون کا باعث یہ حکم نامہ ہے:

"وَلاَ تَقْتُلُواْ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلاَّ بِالحَقِّ وَمَن قُتِلَ مَظْلُوماً فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهِ سُلْطَاناً فَلاَ یُسْرِف فِّیْ الْقَتْلِ إِنَّهُ کَانَ مَنْصُوراً."

(''اور کسی جان کو جس کا مارنا اللہ نے حرام کر دیا ہے ہرگز ناحق قتل نہ کرو۔ اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت میں مار ڈالا جائے ہم نے اس کے وارث کو طاقت دے رکھی ہے پس اسے چاہیے کہ مار ڈالنے میں زیادہ نہ کرے بیشک وہ مدد کیا گیا ہے۔'') (سورۃ بنی اسرائیل، آیت:33)

OOO

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

یونانی طب میں (مانع حمل ادویہ اور تدابیر)

مصنف: ام الفضل

صفحات: 80

قیمت: -/311 روپئے

معالجات (اول تا چہارم)

مصنف: وسیم احمد اعظمی

قیمت: -/4555 روپئے (سیٹ)

شراب نوشی اور منشیات کی لت

مصنف: حسین فاروقی

صفحات: 100

قیمت: -/8 روپئے

قبالیات

مصنف: سید محمد عباس رضوی

صفحات: 345

قیمت: -/58 روپئے

امراض الاطفال

مصنف: خورشید احمد شفقت اعظمی

صفحات: 568

قیمت: -/120 روپئے

علاج بذریعہ غذا

مصنف: احتشام الحق قریشی

صفحات: 512

قیمت: -/90 روپئے

₹ 90/-

ISBN: 978-93-5160-040-4

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025